جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

Printed By

ناشر: سیکریٹری جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپوزنگ : گورمیت سنگھ

سرورق : امتیاز احمد

مطبع : آر۔ایم۔پرنٹرس

قیمت : ۲۰/روپے

☆......خط و کتابت کا پتہ:
محمد اشرف ٹاک
ایڈیٹر ''شیرازہ'' اُردو
جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
سرینگر/جموں

فہرست

☆ ☆ ☆

حرفِ آغاز

ریاست جموں و کشمیر صدیوں سے اُردو کا گہوارہ رہی ہے اور اس سرزمین سے ایسے نامور ادیب اور قلم کار اُٹھے ہیں جنہوں نے اُردو زبان اور اس کے ادبی سرمائے کو کئی لحاظ سے مالا مال کیا۔ اُردو کی مقبولیت اور اس کی اثر آفرینی نے آج سے قریب ڈیڑھ سو سال قبل اس وقت کے حکمرانوں کو یہ حوصلہ بخشا کہ انہوں نے اِسے باضابطہ طور جموں و کشمیر کی سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ یہ وہ دور تھا جب اُردو یہاں کی روزمرہ کی زندگی میں رچی بسی تھی، مال، عدلیہ حتیٰ کہ حکومت کے روز مرہ کے کام کاج کے لئے اُردو نے اپنے آپ کو بالکل مناسب اور موزوں ثابت کیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کو بھی اُردو کے شانہ بشانہ فروغ حاصل ہوا لیکن اُردو کی مقبولیت کسی طور ختم نہیں ہوسکی۔ اُردو آج بھی ریاست کی سرکاری زبان ہے اور پورے ملک میں واحد ریاست ہے جسے یہ شرف حاصل ہے۔ جموں و کشمیر محبانِ اُردو کی اُمیدوں کا محور بھی ہے۔ اِس لحاظ سے اُردو داں طبقے کے ساتھ ساتھ اُردو کے فروغ کے لئے کام کر رہے اداروں پر بھی بھاری ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں کہ ریاست کو اُردو کا ایک مضبوط مرکز بنائیں۔

اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے سے اُردو کی آبیاری کے لئے حسب استطاعت کوششیں کر رہی ہے۔ اُن میں سمیناروں، کانفرنسوں، ورکشاپوں، اُردو ادیبوں کے ساتھ ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ اُردو زبان میں وسیع اشاعتی پروگرام شامل ہے۔

شیرازہ کے وساطت سے ریاست کے علمی، ادبی اور ثقافتی شعبوں میں تحقیق اور ان شعبہ جات میں انجام دی جارہی سرگرمیوں کو صاحبانِ ذوق تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ نو آموز قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کے لئے مناسب پلیٹ فارم مہیا کیا گیا ہے۔ ریاست میں اُردو نثر کا گنج ہائے گراں مایہ موجود ہے جس میں وقت کے ساتھ ساتھ خاطر خواہ اضافہ ہوتا جارہا ہے لیکن ہر زندہ و جاوید زبان کی طرح اُردو میں بعض ایسے مسائل اُبھرتے رہے ہیں جن پر غور و فکر لازمی بن جاتا ہے تاکہ اس سلسلے میں نئے امکانات تلاش کئے جاسکیں۔ اِن ہی مقاصد کے تحت اکیڈیمی نے اپریل ۲۰۱۳ء کے تیسرے ہفتے میں ''جموں و کشمیر میں اُردو نثر'' موضوع پر ایک سمینار کا اہتمام کیا جس میں اُردو کے نامور ادیبوں اور اسکالروں نے حصہ لیا۔ سمینار میں کلیدی خطبے کے بعد جموں و کشمیر میں اُردو ڈرامہ، تحقیق، افسانوی ادب، غیر افسانوی ادب اور دیگر موضوعات پر مقالے پیش کئے گئے اور بحث و تمحیص ہوئی۔ شیرازہ کا زیرِ نظر شمارے سمینار میں پڑھے گئے، کلیدی خطبے اور مقالات پر مشتمل قارئین کے مطالعہ کے لئے پیشِ خدمت ہے۔ مقالات میں ریاست میں اُردو نثر کے حوالے سے بعض لطیف نکتوں کی نشاندہی کی گئی جس میں بحث و مباحثے کی کافی گنجائش موجود ہے۔

اُمید ہے کہ قارئین کو ہماری یہ کوشش پسند آئے گی۔ ہمیں آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

خالد بشیر احمد

سیکریٹری

خطبہ استقبالیہ

ریاست میں اُردو نثر کی تاریخ، موجودہ صورتحال، مسائل اور امکانات جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے زیرِ اہتمام ۱۷ر اپریل کو اکیڈیمی کے کے ایل سہگل ہال میں ''جموں و کشمیر میں اُردو نثر'' کے موضوع پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ریاست میں اُردو نثر کی تاریخ، موجودہ صورتِ حال اور اس حوالے سے مسائل اور امکانات پر مقالے پیش کئے گئے اور بحث و مباحثہ ہوا۔ اکیڈیمی آج ''جموں و کشمیر میں اُردو نثر'' کے عنوان سے سمینار کا انعقاد کرنے کا شرف حاصل کر رہی ہے۔ یہ سرزمین صدیوں سے اُردو کا گہوارہ رہی ہے اور یہ ایسے نامور ادیبوں کی آمجگاہ رہی ہے جنہوں نے اُردو زبان اور اس کے ادبی سرمائے کو کئی لحاظ سے مالا مال کیا۔ یہاں کی ادبی رنگا رنگ محفلیں اس وقت بھی اُردو ادب کی تاریخ کی زینت ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۴۷ء میں جموں صوبے میں قریب درجنوں ہفتہ وار اور روزنامہ اُردو اخبارات شائع ہوا کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کو بھی اُردو کے شانہ بشانہ فروغ حاصل ہوا لیکن اُردو کی مقبولیت کسی بھی طور ختم نہیں ہوسکی اور زندہ دلانِ جموں برابر جوش اور جذبے سے اُردو کی ادبی محفلوں میں شریک ہوئے ہیں اور اُردو کی آبیاری اپنا فرض جان کر کرتے ہیں۔ اُردو ریاست کی سرکاری زبان ہے اور پورے ملک میں واحد ایسی ریاست ہے جسے یہ شرف حاصل ہے اس لحاظ سے ہم پر بھاری ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے کہ ہماری ریاست کو اُردو کا ایک مضبوط مرکز

بنانا ہے۔ یہ سیمینار منعقد کرنے کی غرض وغایت جہاں ماضی کی حصولیابیوں کا جائزہ لینا ہے وہیں یہ مستقبل کے لئے ہمارے ارادے ظاہر کرنے اور پیش بندی کا سنہری موقعہ بھی فراہم کرے گا۔

ہمیں خوشی ہے کہ آج اس تقریب میں ہمارے درمیان اُردو کے سرکردہ ادیبوں' شاعروں' قلمکاروں اور اُردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے والوں کی ایک کہکشاں تشریف فرما ہے جن کے مقاصد جلیل ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اُن کے زرّیں خیالات جاننے کے بعد ہماری راہیں مزید روشن ہونگی کیونکہ اکیڈیمی گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصہ سے اُردو کی آبیاری کے لئے حسبِ استطاعت جو کوششیں کر رہی ہیں اُن سے آپ یقیناً واقف ہیں۔ اُردو کلچر قائم کرنے کے لئے آج سے پچاس سال قبل ہمارے ادارے نے جو لائحہ عمل وضع کیا تھا اُن میں سیمناروں' کانفرنسوں' ورکشاپوں' مشاعروں' اُردو کے ادیبوں کے ساتھ ملاقاتوں اور اس قبیل کے دیگر پروگراموں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اُس کے بہت ہی حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے ہیں۔ اس مضبوط بنیاد سے کئی دیگر زبانوں کو بھی فائدہ حاصل ہوا جس نے آگے چل کر ایک کارواں کی صورت اختیار کی ہے۔ اتنا ہی نہیں ہمارا واضح نصب العین ہے کہ اکیڈیمی کی اُردو مطبوعات اور رسالوں کی وساطت سے ریاست کے علمی' ادبی اور ثقافتی شعبوں میں تحقیق اور ان شعبہ جات میں انجام دی جارہی سرگرمیوں کو اہلِ نظر اور صاحبانِ ذوق تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ نو آموز قلمکاروں کو مناسب پلیٹ فارم مہیا کر کے اُن کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی جائے۔ ساتھ ہی ہمارے روابطہ ملک کے سرکردہ اُردو ادیبوں اور اُردو کو فروغ کے لئے قائم اداروں کے ساتھ رہے ہیں جس سے جہاں ہماری ثقافت کی آبیاری ہوئی وہیں ریاست میں اُردو زبان کی ترویج واشاعت کے لئے مناسب ماحول فراہم ہوا ہے۔ اس سلسلے میں اعداد وشمار کا اعادہ تضیع اوقات ہوگی۔ گزشتہ دو تین برسوں میں اکیڈیمی کی طرف سے شائع ہونے والی بعض مطبوعات کا ذکر یہاں پر ضروری ہے جو ہماری اُمیدوں اور حوصلوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ سالنامہ ہمارا ادب کا مولانا جلال الدین رومیؒ نمبر، ہم عصر تھیٹر نمبر، فیض احمد فیض نمبر،

شیرازہ کا ہمعصر شعری انتخاب نمبر، مرزا یسین بیگ نمبر، عمر مجید نمبر، مقبول فدا حسین نمبر، پشکر ناتھ ٹکو نمبر، میراجی نمبر، شیرازہ کا سات جلدوں پر مشتمل جموں۔ کشمیر۔ لداخ نمبر، شمیم احمد شمیم نمبر، غلام رسول سنتوش نمبر، پی این کے بامزئی نمبر، میر غلام رسول نازکی نمبر، فرید پربتی نمبر، محمد یوسف ٹینگ نمبر بطور مشتے از خروارے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اس دوران کشمیر کی اوّلین تاریخ نیل مت پوران کا اُردو ترجمہ بھی سامنے آیا ہے۔ اس وقت بھی قریب نصف درجن اُردو مطبوعات جن میں پروفیسر اکبر حیدری کی معرکہ آرا تصنیف ''اقبال...... احباب و آثار'' شجاع سلطان کا مجموعہ کلام ''خواب زار روّاں پریس سے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ اکیڈیمی گزشتہ برس سے ''ثقافت'' کے عنوان سے اُردو میں اپنا دو ماہی خبر نامہ شائع کر رہی ہے جس میں ریاست بھر میں ہو رہی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ثقافتی ورثے کے بارے میں مفید جانکاری بھی فراہم کی جاتی ہے۔ ہماری اس کوشش کے بہت ہی حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے ہیں۔ بہر حال، جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ یہ مقدور بھر کوششیں ہماری اُمیدوں اور حوصلوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا بیٹھے اُردو کی نوحہ گری کو اپنا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں۔ آج کی اس اُمید افزا تقریب میں، میں اکیڈیمی کی طرف سے آپ سبھی خواتین و حضرات کا دل کی عمیق گہرائیوں سے استقبال کرتا ہوں کہ یہاں پر جو مقالے پیش کئے جائیں گے اور جو ثمر آور بحث و مباحثہ ہوگا وہ اُردو کے فروغ کے کاز میں ہماری رہنمائی کرے گا۔

خالد بشیر احمد

۱۷ر اپریل ۲۰۱۲ء

☆

پروفیسر ظہورالدین

جموں وکشمیر میں اُردو نثر

ریاست میں اُردو کا چلن اُن سیاسی وسماجی تہذیبی وتمدنی اور علمی وادبی روابط کی دین ہے جو قدیم زمانے سے ہی اُس کے اور برصغیر ہندوپاک کے مابین قائم چلے آرہے ہیں۔ ملک میں نمودار ہونے والی ہر تبدیلی کے اثرات یہاں مرتب ہوتے رہے۔ چنانچہ ریاستی تاریخ کے ماتھے پر جو سلوٹیں آج ہم کو نظر آتی ہیں وہ اُنھیں کروٹوں کی دین ہیں جو وقتاً فوقتاً ملک کی فضا میں ارتعاش پیدا کرتی رہیں۔

ہر زبان کی طرح ریاست میں اُردو کے تحریری چلن کی روایت کا آغاز بھی نظم سے ہوا۔ نثر کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ چنانچہ ملک کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی نثر کی روایت ہمیں دو حصوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ غیر ادبی نثر اور ادبی نثر۔

غیر ادبی نثر کا آغاز پہلے ہوا اور ادبی نثر کا بعد میں۔ پہلے ریاست کی سیاسی وسماجی ضرورتوں کے لئے اُسے برتا گیا بعد میں پھر ادبی مقاصد کے لئے۔

غیر ادبی نثر کا آغاز ہمیں ڈوگرہ حکمرانوں کے دورِ حکومت سے ہی ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ محافظ خانہ جموں میں ایسا بہت سا مواد موجود ہے جو اُردو نثر کے سرکاری استعمال کی نشاندہی کرتا ہے۔ خاص طور سے ایسے بہت سے قلمی اشتہار محفوظ ہیں جو عوام کی اطلاع کے لئے وقتاً فوقتاً مہاراجہ گلاب سنگھ اور دوسرے مہاراجاؤں کے زمانے میں جاری کئے گئے۔ یا ایسے پروانہ راہداری موجود ہیں جو غیر ریاستی افسران کو سفر کے سہولیات کے لئے جاری کئے گئے۔ سرکاری اہلکاران کی مرتب کردہ انتظامی رپورٹیں بھی موجود ہیں جو وقتاً فوقتاً مہاراجوں کی خدمت میں پیش کی جاتی رہیں۔ اسی طرح کی ایک رپورٹ لالہ بوٹا مل کی مرتب کردہ ہے جن کو یہ ذمہ داری مہاراجہ گلاب سنگھ نے تفویض کی تھی کہ جموں میں جو چائے کی کاشت کی گئی ہے اس بارے میں معلومات حاصل

کر کے اُن کی خدمت میں پیش کریں۔ یہ رپورٹ چوں کہ ریاست میں غیر ادبی اُردو نثر کے استعمال کے ابتدائی نمونوں میں سے ایک ہے اس لئے اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کرنا بے جا نہ ہوگا۔ لالہ بوٹا مل لکھتے ہیں:

''غریب پرور کذا حسب الحکم پروانہ ہذا سے مطلع ہوکر عرض پرداز ہوں کہ جو چائے بوٹہ ہائے جموں میں لگائے گئے ہیں وہ بخوبی کاشت ہو گئے ہیں اور جو تخم چائے سرکار سے عنایت ہوا تھا اور باغبان بھی سرکار سے ملے تھے وہ بوٹہ ہائے کو لگانے میں اور کاشت کرنے تخم چائے میں تن دہی نہیں کرتے اور پیش گاہِ مہاراجہ صاحب بہادر سے بھی پروانہ بنام کمترین بدیں مضمون صادر ہوا ہے کہ باغبانانِ مذکور کاشت کرنے تخم چائے کے تن دہی نہیں کرتے۔ لہٰذا اُس کے عوض اور باغبانان آنے چاہیں''۔

(کشمیر میں اُردو۔ صفحہ:۷۳)

اس اقتباس کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ درباری سطح پر فارسی زبان کے استعمال کے باوجود عوامی سطح کا سارا سرکاری یا دفتری کام اُردو زبان میں ہی انجام دیا جاتا رہا ہے۔ جس سے شستہ اُردو نثر کا استعمال ریاست میں روزمرہ زندگی کے جزو لاینفک کا درجہ حاصل کر گیا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کا دورِ حکومت (۱۸۶۵ء تا ۱۸۸۸ء) اس اعتبار سے اہم ہے کہ اُنھوں نے بدیا بلاس سبھا کے نام سے ایک انجمن قائم کر کے ریاست کی مختلف علاقائی زبانوں کے ساتھ ہی ساتھ اُردو زبان کی ترقی کے بھی دروازے کھول دیئے۔ اُن کے دورِ حکومت میں اس سبھا نے انگریزی، سنسکرت، عربی اور فارسی کی متعدد کتابوں کو اُردو، ہندی اور ڈوگری میں ترجمہ کرا کے نثر کی علمی و ادبی ترقی کو تو ممکن بنایا بدیا بلاس (۱۸۶۶ء) کے نام سے اس سبھا کا ایک آرگن جاری کر کے اُردو اور ہندی کی غیر ادبی، خصوصاً صحافتی نثر کی ترقی کی راہ بھی ہموار کر دی۔ یہ ہفت روزہ اخبار اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں بیک وقت شائع ہوتا تھا جس میں سبھا کی علمی و ادبی اور دوسری سرکاری سرگرمیوں کی روداد عوام کی اطلاع کے لئے چھپتی تھی۔ ساتھ ہی مصدقہ خبریں بھی شامل کی جاتی تھیں۔ اس کے صحافتی معیار کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

''صداقت'' اساس اخبار، بدیا بلاس ہفتہ وار شنبہ کو نصف اُردو، نصف ناگری بنظرِ فایدہ عام بہ اہتمام تمام، طبع ہو کر اس مطبع سے شائع کیا جاتا ہے اور دوسرے بروز بخدمات فیض مآب

ناظرین والا تمکین بھیج دیا ہے۔ عبارت اس کی زوائد سے مبّرا ہے اور حشو سے معرا۔ اخبار صحیح، غلط نہیں، صفحات خوش خط، بہ خط نہیں۔ جو خبر ہے کارسپانڈنٹان صدق مقال کی زبانی ہے یا خلاصہ اخبارات انگریزی و ہندوستانی ہے۔ بایں ہمہ بنظرِ خریداری قیمت مختصر ہے.........''

(کشمیر میں اُردو۔ جلد دوم، صفحہ ۱۲۱)

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی اُردو زبان کے تئیں خدمات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم لکھتے ہیں:

''مہاراجہ رنبیر سنگھ کی یہ ساری دلچسپیاں، ریاست میں اُردو کا ذوق پیدا کرنے کے سلسلے میں اہمیت رکھتی ہیں لیکن اُن میں سب سے زیادہ مہتم بالشان کارنامہ اُن کا قائم کیا ہوا دارالترجمہ یا محکمہ تالیف و ترجمہ جو مغربی علوم کو ریاست کی زبانوں اور خاص طور پر اُردو میں منتقل کرنے کے مقصد سے قائم کیا گیا تھا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بہت سی کتابوں کے تراجم اُردو میں کرائے۔ ان کی تعداد اگرچہ بہت زیادہ ہے لیکن کچھ کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) **رسالہ مورچہ نامہ**:۔ اسے پنڈت بخشی رام نے ۱۸۶۸ء میں انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا۔

(۲) **تاریخ رہنمائے کشمیر**:۔ یہ انگریزی کی کتاب کشمیر ہینڈ بک کا اُردو ترجمہ ہے۔ جس کو بابو نصر اللہ نے ۱۸۷۴ء میں انجام دیا۔ صفحات کی تعداد ۴۲۳ ہے۔

(۳) **تحریر اقلیدس اردو**:۔ ۱۱۳ صفحات پر مشتمل یہ لکھی جیومٹری کی کسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ابتدائی اُردو اور آخری صفحات ضائع ہو جانے کی وجہ سے ترجمہ نگار کا پتہ نہیں چلتا۔

(۴) **احوالِ ملکِ لداخ**:۔ یہ کتاب ۱۸۴۹ء میں تالیف کی گئی جس میں لداخ کے عوام کے تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ترجمہ ہے یا تصنیف اس کا بھی پتہ نہیں چلتا ہے۔

(۵) **رہنمائے رسوئیاں**:۔ ۳۲۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مختلف کھانوں کی تیاری کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ تصنیف ہے یا ترجمہ پتہ نہیں چلتا۔

(۶) **ذکر اولیائے ہنود**:۔ ۳۰ صفحے کی یہ کتاب نابھ داس کی کتاب ''بھگت مالی'' کا نامکمل ترجمہ ہے۔ نہ ترجمہ نگار کا پتہ چلتا ہے نہ تاریخِ ترجمہ کا۔

(۷) مخزن الادویہ: یہ ادویات سے متعلق کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ نہ تو ترجمہ نگار کا پتہ

چلتا ہے نہ تاریخ ترجمہ کا۔

(۸) **ترجمۂ تاریخ انگلستان** :-۲۰۸ ر صفحے کی کسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ترجمہ نگار اور تاریخِ ترجمہ دونوں کا پتہ نہیں چلتا۔

(۹) **رسالۂ کاغذ سازی** :-کاغذ بنانے سے متعلق کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔صفحات کی تعداد ۳۰ ہے ترجمہ نگار اور تاریخ ترجمہ کے بارے میں معلومات ندارد ہیں۔

(۱۰) **رسالۂ علم رنگریزی** :-رنگوں کے استعمال سے متعلق کسی رسالے کا ترجمہ ہے۔ تاریخِ ترجمہ اور ترجمہ نگار کے بارے میں معلومات درج ہیں۔

(۱۱) **جنگ یرموک** :-۷۷ر صفحات کی اس کتاب میں خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی جنگِ یرموک کے بارے میں معلومات درج ہیں۔یہ ترجمہ ہے یا تالیف اس کا پتہ نہیں چلتا۔

(۱۲) **بھگوت گیتا اُردو**: بھگوت گیتا کا اُردو روپ ہے۔ترجمہ نگار یا تاریخِ ترجمہ کا پتہ نہیں چلتا۔ صفحات کی تعداد ۳۰۶ ر ہے۔

(۱۳) **ماہ مقیمہ**:-یہ فارسی نظم ماہ مقیمہ کا اُردو ترجمہ ہے۔

(۱۴) **رسالۂ تیر اندازی** :-مہاراجہ رنبیر سنگھ کے حکم پر جموں کے استاد مولوی غلام غوث نے تیراندازی کے فن سے متعلق کسی انگریزی کتاب کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔

(۱۵) **ترجمۂ تاریخ جموں**:-یہ ہندی کی تاریخِ جموں کا اُردو ترجمہ ہے۔

ترجمہ نگاری کا یہ سلسلہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت تک ہی جاری رہا۔اس کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر سروری مزید فرماتے ہیں:

”رنبیر سنگھ کے جانشین مہاراجہ پرتاب سنگھ کو علمی امور سے دلچسپی نہیں تھی۔اس لئے کام کا یہ سلسلہ مسدود ہو گیا اور مخطوطات کا بچا کھچا ذخیرہ جو سری نگر میں محکمۂ ریسرچ کے کتب خانے میں پہنچا اُس کے تحفظ اور تہذیب میں محکمہ کے سابق ناظم صاحب زادہ حسن شاہ نے دلچسپی لی اور اُس کے اُردو مخطوطات کی فہرست تیار کرنے اور تفصیلات مہیا کرنے میں میں نے ہاتھ بٹھایا۔یہ ذخیرہ رنبیر گلگشن کے نام سے موسوم ہے اور اس میں کافی تعداد میں اُردو مخطوطات موجود ہیں۔یہ ساری کتابیں زیادہ تر انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ان میں علمِ طب سے متعلق زیادہ ترجموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے“۔

(کشمیر میں اُردو۔ جلد دوّم صفحہ ۸۱۔۸۲)

یہ ترجمے نہایت آسان اُردو نثر میں کیے گئے جس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے۔

''اس گرنتھ کا نام ہے میٹریا مڈیکا۔ اس فن کا نام ہے، جس سے فائدہ اور استعمال دوا کا معلوم ہوتا ہے اور جب تک اِس فن سے واقفیت کماحقہ نہ ہو تب تک بیماری کا علاج نہیں کیا جاتا ہے۔ اس واسطے تشریح الامراض کے بیشتر مدارس طبی میں اِس فن کو سکھاتے ہیں، لیکن فقط دوا کی خاصیت، فائدہ اور استعمال کا جاننا کافی نہیں ہے۔ ان کے ملانے اور وزن کرنے کی ترکیب سے بھی واقفیت پیدا کرنی ازبس ضروری ہے۔''

ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''تیسری قسم گوند کی اکیشیا اروے کا نامک ہے جس کو سنسکرت میں 'گرسندر' کہتے ہیں اور ہندوستان میں جو دیجول کا ورکش وادلیہ کر کے ہوتا ہے اُس کے گوند کی خاصیت بھی اسی طرح ہے''۔

''اناٹومی'' پر محفوظ ایک مخطوطے کا اقتباس بھی دیکھ لینا نامناسب نہ ہوگا۔ علمِ طب کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''طب وہ علم ہے جس سے انسان (آدمی) کی تندرستی اور بیماری کا حال دریافت ہوتا ہے اور اُس کے قاعدوں پر عمل کرنے سے صحت کا قیام اور اَمراض کا زوال ہو سکتا ہے''۔

(کشمیر میں اُردو: صفحہ ۸۵۔۸۶)

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے آخری زمانے میں دیوان جولا سہائے نے ''ہندو کلاسیکل ڈکشنری'' کے عنوان سے ایک پائے کا کام کیا۔ جو ۱۸۸۰ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۹۷ء میں مطبع خادمِ تعلیم لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں دیوتاؤں اور اوتاروں کے ویدک اور پورانک حالات اور راکھشوں، ریشیوں، راجاؤں اور مصنفوں کی سوانح عمریاں رقم کی گئیں ہیں۔ زبان بہت شستہ ہے۔ ایک اقتباس سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہندوؤں کی قدیم تاریخ مکمل اور مسلسل نہیں مل سکتی ....اگرچہ اس بات میں بہت سعی اور جدوجہد کی گئی کہ مصنفوں کے پورے حالات لکھے جاویں اور کتاب ہذا کو زیادہ دلچسپ بنایا جائے مگر یہ مراد پوری نہ ہو سکی .... کیوں کہ مصنفوں کی کوئی تاریخی کتاب نظر سے نہیں گزری۔ علماء سلف کو شوق وقائع نویسی رہا تو راجاؤں،

ریشیوں وغیرہ کے حالات لکھنے کا شوق رہا۔ کسی کی طبیعت اس طرف مائل اور راغب نہیں ہوئی کہ اِن عالموں اور مصنفوں کے حالات بھی بطورِ سوانحِ عمری ہا تحریر کیئے جاویں"۔

(کشمیر میں اُردو۔ جلد دوم۔ صفحہ:۱۱۸)

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے ہی زمانے میں پنڈت ہرگوپال خستہ نے اُردو نثر کے ارتقاء میں جو خدمات انجام دیں، اُنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے گلزارِ کشمیر نام سے ریاست کی تاریخ مرّتب کر کے لاہور سے شائع کرائی۔ آپ کے چھوٹے بھائی سالگرام سالک نے تعزیراتِ جموں و کشمیر کی شرح کے ساتھ ساتھ ضابطہ دیوانی، قانونِ رجسٹری اور دوسری قانونی دستاویزات کو بھی آسان اُردو نثر میں منتقل کیا۔ ان کے علاوہ لغات، محاوراتِ اُردو کے نام سے چھوٹے چھوٹے رسائل بھی مرتب کیئے۔

غیر ادبی اُردو نثر کے ارتقاء کے سلسلے میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے سے ہی ایک ادیب و دانشور کی خدمات لامثال ہیں۔ آپ کا نام حسن ابنِ علی ہے۔ آپ کی ولادت ۱۲۶۸ ہجری میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم عربی، فارسی میں ہوئی بعد میں اُردو اور انگریزی میں بھی دسترس حاصل کی۔ قوم کی زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے اُن کی فلاح و بہبود کے لئے جو علمی و ادبی خدمات انجام دیں اُن کے ذکر کے لئے ایک متوسط مقالہ تحریر کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کی یہاں گنجائش نہیں البتہ اتنا کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ نے مختلف مذہبی و سماجی موضوعات پر قلم اُٹھا کر اُردو نثر کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ اُردو نثر پر آپ کے عُبور کا اندازہ درجِ ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

"افسانوں میں سرمائے کی وجہ سے ہی درجہ بندی ہو سکتی ہے اور ذات پات کا سارا دارومدار اسی پر ہے۔ چوں کہ میرے والد صاحب نے تجارت میں نمایاں ترقی حاصل کر کے بمبئی، کلکتہ کے ساتھ درآمد و برآمد کا کام جاری کیا۔ نیز ٹرانسپورٹ کی دقتوں کے بارے اہلیانِ کشمیر میں سب سے پہلے زیارت کربلائے معلیٰ کا شرف حاصل کیا جس کی وجہ سے بٹ تو درکنار، کربلائی کا خطاب نام کے ساتھ دم تارے کی طرح لگ گیا جو کہ غریب کو حاصل ہونا مشکل ہے۔"

(کشمیر میں اُردو۔ صفحہ:۱۴۹۔۱۵۰)

ریاست میں غیر ادبی اُردو نثر کو اُس وقت خاص طور سے مہمیز ملی جب مہاراجہ پرتاب سنگھ نے

۱۸۸۸ء میں اُردو کو فارسی کی جگہ صوبہ جموں کی عدالتی زبان کا درجہ دیا۔ اس سے اُردو نثر کی دفتری سرگرمیوں میں اضافہ ہونے کی وجہ سے پیشہ ورانہ دفتری اصطلاحوں کے استعمال کو بے پناہ فروغ ملا۔

اسی زمانے میں عیسائی مشنریوں اور مبلغوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اُن کی سرگرمیوں کو یہاں کے عوام نے شک کی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ چنانچہ اُن کے خلاف کتابچے اور اشتہار شائع ہونے لگے۔ سناتم دھرم سبھا کی قیادت میں بہت سی کتابیں اور رسالے شائع ہونے لگے۔ سالک نے بھی مورتی منڈی، دھرم اپدیش اور شاشترارتھ جیسی کتابیں شائع کیں۔ ان کوششوں نے غیر ادبی اُردو نثر کے فروغ اور ارتقاء میں قابلِ قدر کردار ادا کیا۔

ریاست میں پرنٹنگ پریس کے قیام اور بیرونی اخباروں سے روابط کی وجہ سے اُردو نثر کو ترقی کرنے کے مزید مواقع ملے۔ ریاست کے متعدد ادیب و دانشور بیرونی اخباروں میں مضامین شائع کرانے لگے۔ خاص طور سے لاہور، لکھنو اور دہلی سے چھپنے والے اُردو اخباروں میں ان تحریروں کو زیادہ جگہ ملنے لگی۔ اِن کوششوں سے جہاں ایک طرف ریاستی عوام میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی وہیں اُردو نثر کی سرگرمیوں میں بھی قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ محمد دین فوق جیسے بڑے قلمکاروں کی خدمات اس سلسلے میں خاص طور سے اہم ہیں۔ اُنھوں نے لاہور سے متعدد اُردو اخبار جاری کئے تا کہ ریاستی عوام کو غفلت کی نیند سے بیدار کر کے اُن وسائل سے روشناس کیا جائے جن سے وہ دوچار تھے۔

ریاست میں اُردو صحافت کے آغاز نے ان کوششوں میں مزید سرعت پیدا کی ۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف نے اُردو کا پہلا اخبار ''رنبیر'' جموں سے جاری کیا۔ چنانچہ اپنے رشحاتِ تخیل کو عوام تک پہنچانے کا ریاستی قلم کاروں کو ایک موثر ذریعہ ہاتھ آگیا۔ دھیرے دھیرے ریاستی ادیب فن کار اس اخبار سے وابستہ ہونے لگے جس نے ایک ادبی دبستان کی صورت اختیار کر لی۔ اس اخبار میں شائع ہونے والی زیادہ تر تحریریں چوں کہ اُردو نثر میں ہوا کرتی تھیں اس لئے جدید اُردو نثر کی ریاست میں پروان چڑھنے کے زیادہ سے زیادہ موقعے ہاتھ آنے لگے۔ اس اخبار سے وابستہ ہو کر جن قلمکاروں نے نام کمایا اُن کے نام حسبِ ذیل ہیں:

پریم ناتھ بزاز، کشب بندھو، پریم ناتھ رونق، بلدیو پرشاد شرما، عشرت کشتواڑی، نشاط کشتواڑی، دیا کرشن گردش، غلام حیدر چشتی، قیس شیروانی، تاراچند ترسل سالک، وشوناتھ کیرنی، ذوالفقار علی نیم، حبیب اللہ، سری رام، بدری ناتھ وکیل، گردھاری لال آنند، شرون ناتھ آفتاب،

ارجن سنگھ عرش، کشن سمیلپوری ، منوہر لال دل، متھر اداس شوق، مرزا مبارک بیگ ، رام کرشن غافل، ماسٹر زندہ کول، نرسنگ سہائے چوہان ، امرناتھ شاہد، سیوک رام ناصر، محمد اکبر اخگر، محمد عمر نور الہیٰ، محی الدین احمد گمان اور پنڈت نند لال طالب۔

سرینگر کا پہلا اُردو اخبار وتستا تھا جو پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں ۱۹۳۳ء میں نکلا۔ اس کے بعد بزاز اور شیخ محمد عبداللہ نے ہمدرد ۱۹۳۵ء میں جاری کیا۔ ان ابتدائی کوششوں کے بعد ریاست میں اُردو صحافت کا دور شروع ہوا جس نے اُردو نثر کے کثیر العباد ارتقاء کے راستے کھول دیئے۔ اس دور کے اہم قلمکار پردیسی ، دینا ناتھ واریکو شاہد، نیاز کامراجی ، انور پریمی، وشوناتھ ورما، آنند کول بامزئی، شام لال رینا، اور تیرتھ کاشمیری تھے۔ ریاست کا دوسرا اہم اخبار جس نے غیرادارتی وادبی اُردو نثر کے ارتقاء میں قابلِ قدر کردار ادا کیا وہ جموں سے چھپنے والا ہفت روزہ چاند ہے جو اُردو کے ایک اہم افسانہ نگار نرسنگداس نرگس کی قیادت میں ۱۹۳۷ء سے نکلنا شروع ہوا۔ چاند کے علاوہ نرسنگداس نرگس ایک ادبی ماہنامہ پریم جموں بھی نکالتے رہے۔ ان دونوں جریدوں نے بھی ایک اور ادبی دبستان کو جنم دیا جس کا نام کشمیر سکول آف اُردو رائیٹرس تھا۔ اس اسکول نے بھی جدید غیر ادبی وادبی اُردو نثر کے ارتقاء میں قابلِ قدر کردار ادا کیا اور اس میدان میں جن ریاستی قلمکاروں نے خصوصاً نام کمایا اُن میں دیوان نرسنگداس کا نام قابلِ ذکر ہے۔ آپ کی اس سلسلے کی اہم کتاب تاریخ جدید ڈوگرہ دیس ہے۔ پریم ناتھ بزاز کی کشمیر کا گاندھی، تیرتھ کاشمیری کی دیوتا، وشوانا تھ در ماں کی تلاشِ، حقیقت اور انکشافاتِ حقیقت بھی اسی زمانے کی تحریریں ہیں۔ تاریخ راجگان جموں وکشمیر ۱۹۲۹ء مرتبہ ٹھاکر کاہن سنگھ بلاوریہ اور مختصر تاریخِ جموں ۱۹۳۹ء از حشمت اللہ...... بھی غیرادبی اُردو نثر کے نمونے ہیں۔

اس کے بعد ریاست کے دوسرے اخباروں نے بھی غیرادبی اُردو نثر کو فروغ دینے میں قابلِ قدر کردار ادا کیا۔ ان کوششوں کی وجہ سے ریاست میں تہذیبی وتمدنی سیاسی وسماجی اور عالمی وسائنسی مضامین اور کتب ورسائل پر مشتمل غیرادبی اُردو نثر کا بے پناہ ذخیرہ جمع ہوگیا جس کا فرداً فرداً ذکر کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ مفید۔ تاہم جن اخباروں نے نمایاں کارکردگی کا ثبوت دیا اُن میں رنبیر، مارتنڈ، ہمدرد اور وتستا کے بعد جن روزناموں یا ہفت روزوں اور ماہناموں کے نام لئے جاسکتے ہیں وہ ستوش، چاند، کیسری، خدمت، آفتاب، سرینگر ٹائمنر، نوائے صبح، سویرا، امر اُجالا، پاسبان، شیرازہ،

ہمارا اداب، بازیافت اور اقبالیات ہیں۔

ملک میں جاری تحریکِ آزادی کے زیرِ اثر جب ریاست میں بھی شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں تحریک کا آغاز ہوا تو اس سے اُردو نثر کے فروغ کے مزید امکانات روشن ہوئے۔ تحریک کے سارے مسوّدے، سارا پروپیگنڈا اسی زبان کی وساطت سے انجام پذیر ہوا۔ اشتہار اچھپتے، بینر بنائے جاتے، تقریریں اور محضر نامے تیار ہوتے، عوام کی اطلاع کے لئے خبر نامے شائع ہوتے۔ سرکاری زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے بھی درس و تدریس کے سارے مرحلے اُردو نثر میں ہی طے ہوتے۔

نصاب کی ساری کتابیں جن میں سبھی مضامین شامل تھے اسی زبان بلکہ آسان اُردو نثر میں تیار کی گئیں۔ سائنس، حساب، تاریخ، جغرافیہ اور الجبرا کی کتب اسی زبان میں تیار کی گئیں۔ اس سے آسان غیر ادبی اُردو نثر کو نہ صرف فروغ ملا بلکہ طلبہ و طالبات میں بھی اُسے پڑھنے لکھنے کا رجحان تیزی سے بڑھا۔

نیشنل کانفرنس نے جب ۱۹۴۴ء میں نیا کشمیر کا آئین مرتب کیا تو ابتداءً اُسے بھی آسان اُردو نثر میں ہی شائع کیا گیا۔ اس سے بھی اُردو زبان خصوصاً اُردو نثر کے استعمال کے امکانات روشن ہوئے۔

ریاست میں تیکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت کا آغاز بھی مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا جس کو مہاراجہ پرتاب سنگھ نے زیادہ تقویت پہنچائی۔ ابتداءً ان کورسز کی نصابی کُتب بھی اُردو ہی میں تالیف و ترجمہ کے ذریعے فراہم کی گئیں۔ اس سے تیکنیکی اصطلاحوں کا وافر ذخیرہ اُردو نثر میں داخل ہوا جس سے اُردو زبان کی تدریسی قدرت میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے دورِ حکومت میں اس عمل کو مزید فروغ ملا۔ ڈوگرہ حکمرانوں کے کام کو اگر جاری رکھا گیا ہوتا تو ریاست کو یہ اعزاز بھی حاصل ہو جاتا کہ یہاں اعلیٰ تعلیم ہی نہیں اعلا تیکنیکی، طبی اور سائنسی تعلیم بھی اسی زبان کی وساطت سے دی جا رہی ہوتی۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن نے سب سے زیادہ منفی اثر اُردو زبان پر مرتب کیا۔ فسادات اور ہجرت نے اُردو کی محفلوں کو منتشر نہ کیا ہی بلکہ عوام کے دلوں میں اس کے خلاف تعصب کی ایسی آگ روشن کر دی جس کی آنچ اگلی تین دہائیوں تک فکر و نظر اور تخلیق و تالیف کی کونپلوں کو جھلساتی رہی۔ اس کے باوجود اُردو صحافت، ریڈیو اور محکمہ اطلاعات و نشریات حکومتِ جموں و کشمیر کی مساعی

کے نتیجے میں غیر ادبی اُردو نثر کا سفر افتاں وخیزاں جاری رہا۔ اس دور میں نا مساعد حالات کے باوجود آزادی سے پہلے سے چل رہے تھے بہت سے اُردو اخبارات اگر بند ہوئے تو بہت سے نئے اخبار جاری بھی کئے گئے۔ اُن کی سرکولیشن چاہے کتنی ہی محدود کیوں نہ رہی ہو۔ اس دور کی اکثر غیر ادبی تحریروں کا موضوع بھی تقسیم، فسادات اور ہجرت سے مرتب ہونے والے اثرات ہی تھے۔ شیرازہ بندی کی کوششوں کو ازسرِ نو تحریک دینا بھی مقصود تھا۔

ریڈیو کشمیر جموں اور سرینگر سے نشر ہونے والی تقاریر یا ریڈیو ٹاکس بھی سیاسی و سماجی موضوعات کا احاطہ کرتیں، گو علمی و ادبی موضوعات کی بھی کمی نہ تھی۔

محکمہ اطلاعات ونشریات کے جاری کردہ پریس نوٹ اور حکومت کے احکامات سے متعلق مختلف کتابچے اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اُردو غیر ادبی نثر کو فروغ دینے میں اس دور میں اُس کا کردار بھی قابلِ قدر رہا ہے۔

ریاست میں اُردو ادبی نثر کا آغاز بھی ڈوگرہ حکمرانوں کے دورِ حکومت میں ہی اُن تراجم سے ہوا جو انگریزی، سنسکرت، فارسی اور عربی زبانون کی اہم ادبی کتب کو مقامی زبانوں میں منتقل کر کے عوام کو اُن سے روشناس کرنے اور اپنی زبانوں میں ادب کی تخلیق کو ممکن بنانے کی تحریک کی غرض سے بدیا بلاس سبھا سے وابستہ ادیبوں کے ذریعے کرائے گئے یا اُن لوگوں نے کئے جو آزادانہ طور پر سبھا سے باہر اس طرح کا کام کررہے تھے۔

اِسی زمانے میں ملک میں ہوری علمی وادبی سرگرمیوں کے اثرات کی وجہ سے جب ریاستی عوام میں بھی ادبی ذوق نے فروغ پایا تو اشاعت کی سہولیات میسر نہ ہونے کی وجہ سے ریاستی شائقین ادب اپنی ادبی پیاس بجھانے کے لئے اُردو کی اہم تخلیقی وتنقیدی کتب کی نقلیں بھی تیار کر کے نہ صرف خود اُنھیں پڑھنے لگے بلکہ دوسروں کو بھی اُنھیں پڑھنے کا موقع دینے لگے۔

شہنشاہِ اکبر کی پیروی میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جن حضرات کو اپنے دانشوروں میں داخل کیا اُن میں سے اکثر علماء کی صف میں آتے تھے۔ مثلاً دیوان کرپارام کو فارسی پر کامل عبور تھا۔ انھوں نے گلاب نامہ کی تصنیف ۱۸۶۵ء میں کی۔ دوسرے علماء میں ڈاکٹر بخشی رام، پنڈت گنیش کول شاستری، پنڈت صاحب رام، مولوی غلام حسین طالب لکھنوی، مولوی عبداللہ مجتہد العصر، حکیم ولی اللہ شاہ لکھنوی، حکیم نور الدین قادیانی اور بابو نصر اللہ عیسائی شامل ہیں۔ پنڈت گنیش کول اور پنڈت

صاحب رام، سنسکرت کے عالم تھے۔ حکیم نور الدین قادیانی مرزا غلام احمد قادیانی، کے خلیفہ تھے جو اُن کے انتقال کے بعد اُن کے جانشین قرار دیئے گئے۔ اُنھوں نے اپنی خودنوشت اُردو زبان میں مرتب کی۔ بابو نصر اللہ عیسائی نے کشمیر کے بارے میں ایک انگریزی کتاب کو اردو میں ترجمہ کیا۔

(کشمیر میں اُردو۔ صفحہ: ۸۰)

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی قائم کردہ ودیا بلاس سبھا میں تالیف و ترجمے کا کیا کیا کام ہوا اُس کی طویل فہرست پروفیسر سروری نے کشمیر میں اُردو جلد دوم میں دی ہے۔ یہاں اُس کے بارے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان تراجم نے وہ فضا تیار کی جس نے بعد میں نثر میں تخلیقی ادب کے لئے راہ ہموار کردی۔

ریاست میں اُردو ادبی نثر کی پہلی کتاب کا جہاں تک تعلق ہے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار سے وابستہ مہتا شیر سنگھ کے بخارا کے سفر سے متعلق سفر نامہ کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۸۶۴۔۱۸۶۵ء میں تالیف کیا گیا۔

اس کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے سروری مرحوم لکھتے ہیں:

"اسی نوعیت کی ایک اور اہم دستاویز مہتہ شیر سنگھ کا سفرنامہ ہے جو ۶۷۔۱۸۶۶ء میں مرتب ہوا تھا۔ مہتہ شیر سنگھ رام پور (کشمیر) کے رہنے والے تھے اور رنبیر سنگھ کی سرکار میں ملازم تھے۔ رنبیر سنگھ کو ریاست کی تجارت کو فروغ دینے کا بہت خیال تھا اس لئے انہوں نے مہتہ شیر سنگھ کو ریاست کے پڑوسی ملکوں اور مقامات کا سفر اختیار کرنے اور مقامات اور راستوں کی کیفیت مرتب کرنے پر مامور کیا تھا۔ اسی کی اتباع میں مہتہ شیر سنگھ نے ۱۸۶۷ء میں کابل، بلخ، بخارا وغیرہ کا سفر کیا اور منزلوں کی تفصیل اور ایک منزل سے دوسری منزل کے فاصلے، راستے کی کیفیت مقامات اور شہروں کے حالات پر مشتمل یہ رپورٹ تیار کی تھی، جو سفرنامہ کے نام سے موسوم ہے۔"

(کشمیر میں اُردو جلد دوم، صفحہ: ۱۰۱)

ریاست میں اُردو تصنیف اور تالیف کو مہمیز دینے کا کام اُن تھیٹریکل کمپنیوں نے بھی کیا جو انیسویں صدی کے آخر میں یہاں آکر اپنے کھیل دکھاتی رہیں۔ ان میں ریاستی تھیٹریکل کمپنیوں کا حصہ سب سے زیادہ ہے جو بمبئی سے آکر یہاں اُردو کے مشہور ڈرامے جن میں آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے خاص طور پر اہم ہیں پیش کرتی رہیں۔

جہاں تک ریاست میں اُردو ادبی نثر کا تعلق ہے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت کے دو نامور

ادیبوں کا ذکر نہایت اہم ہے۔

یہ نامور ادیب دو بھائی تھے جن کے نام پنڈت ہر گوپال خستہ اور پنڈت سالگرام سالک ہیں۔

پنڈت ہر گوپال کول خستہ نے مولوی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس کی طرز پر ایک مختصر قصہ گلزارِ قوائد کے نام سے اپنے کسی شاگرد کی تعلیم کے لئے لکھا۔ آپ اُس وقت پٹیالہ کے کسی سکول میں مدرس تھے۔ یہ قصہ ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔ یہ دونوں بھائی کشمیر میں آ کر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ خستہ کی دوسری تصانیف حسب ذیل ہیں۔ چہار گلزار، شگفتہ بہار، حزنِ اختر معروف بہ گُل بہار اور سوانح عمری خستہ وغیرہ۔

سالک نے بھی ایک نثری داستان فسانہ عجائب کی طرز پر ''داستانِ جگت روپ'' لکھی۔ اس میں جگت روپ اور روپ ونتی کی محبت کی داستان رقم کی گئی ہے۔

سالک ایک اچھے انشائیہ نگار بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنے انشائیوں کو گنجینۂ فطرت یا مناظرِ کشمیر'' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اشاعت پذیر ہوا کہ نہیں، معلومات ندارد ہیں۔

آپ کی ادبی نثر کی ایک اور مثال سوانحِ عمری مہاراجہ گلاب سنگھ'' ہے جس سے مہاراجہ کی خدمات کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔

حسن ابنِ علی کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اُردو نثر کو دو نئی اصناف ادب، یاداشت اور ڈائری سے متعارف کرایا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب ابھی اُردو نثر ان اصناف سے کہیں روشناس نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے یاداشتوں اور ڈائریوں کی ۲۴ جلدیں مرتب کیں جو مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت کے ہر پہلو پر تاریخی ترتیب سے روشنی ڈالتی ہیں۔ نمونے کے طور پر جلد ششم ۱۳۱۰ھ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''۱۳۰۹ھ ہجری جس کو سالِ مجموعۂ آفات کہنا، موزوں نہ ہوگا، ہم سے نکل گیا اور سال ۱۳۱۰ھ شروع ہوا۔ اور ہماری زندگی کے برس اور ایام اسی طرح نکلتے جاتے ہیں اور ہم اس کے لئے کچھ خیال بھی نہیں کرتے ہیں۔''

(کشمیر میں اُردو: ۱۵۶-۱۵۷)

اسی زمانے میں اُردو تنقید کے بھی کچھ ابتدائی نمونے ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ منشی سراج الدین، علامہ اقبال کے ہم عصر تھے۔ اقبال اُن کی تنقیدی نظر کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس لئے اُن

کی طویل فارسی نظم ''اسرارِ خودی'' پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مثنوی کا موضوع گو عقائد مقتدمین کے خلاف ہے مگر نہایت لطیف ہے اور جس خوش اسلوبی سے آپ نے اُسے بنایا ہے وہ مصنف کا ہی حصہ ہے۔ قدم قدم پر مولوی رومی علیہ الرحمہ کے کلام کا گمان ہوتا ہے۔ زمانے کی رنگت پہچاننے والے لوگ اس مثنوی کو پڑھا کریں گے اور سر دُھنا کریں گے''۔

انیسویں صدی کے اختتام تک ملک میں چل رہی سیاسی، مذہبی اور ادبی تحریکوں کے اثرات بھی ریاست کی ادبی فضا کو متاثر کر رہے تھے اور یہاں بھی اُسی طرح کے رجحانات کی پیروی کرنے کی کوشش اگر اجتماعی نہیں تو انفرادی سطح پر کی جا رہی تھی۔ بہت سی سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی تنظیموں کی ریاست میں تشکیل نے بھی ادبی روایتوں کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جماعت اسلامی، مسلم لیگ، ہندو مہا سبھا، آریہ سماج اور سناتم دھرم سبھا کی سرگرمیاں اس سلسلے میں خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ دوسری سماجی تنظیموں کے کردار کو بھی اس سلسلے میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کانگریس کے زیر اثر مسلم کانفرنس اور پھر نیشنل کانفرنس کی سرگرمیوں میں آنے والی تیزی نے ادبی تخلیقات کے وجود کے لئے زمین ہموار کی۔ اردو چوں کہ ایک نمائندہ زبان ہی نہیں دفتری زبان کا بھی درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اس لئے نتیجتاً اُردو ادبی نثر کا اچھا ذخیرہ اس زبان میں جمع ہو گیا۔

بیسویں صدی کے آغاز نے ان کوششوں کو مزید سرعت عطا کی۔ کشتواڑ، بھدرواہ، پونچھ، میر پور اور مظفر آباد اُردو کے بڑے تخلیقی مراکز کا درجہ حاصل کر گئے بے شمار ادباء وشعرا نے ان مراکز کی قیادت میں اپنا علمی ادبی سفر نہ صرف شروع کیا بلکہ اپنے انتخاب تخیل سے ان مراکز کی شان کو دو بالا کیا۔

بیرونی ادیبوں کی ریاست میں آمد اور یہاں اُن کے مسلسل قیام نے بھی ادبی فضا کو مستحکم کرنے کا کام کیا۔ خوشی محمد ناظر، اثر صہبائی، جعفر علی خان اثر کی موجودگی نے ادبی زمین کو مزید زرخیز بنانے کا کام کیا۔ پھر مشاعروں اور ادبی جلسوں میں شرکت کے لئے باہر سے آنے والے شاعروں اور افسانہ نگاروں نے بھی ادبی سرگرمیوں کو مہمیز دی۔ اس سلسلے میں جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، دتہ تریہ کیفی، وفا، جوش ملیسانی اور متعدد دوسرے شعراء کی ریاست میں بار بار آمد نے ریاستی ادیبوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو تحرک عطا کیا۔

ریاست کے چار نامور جریدوں، رنبیر (۱۹۲۴ء) جموں، رتن جموں، چاند جموں (۱۹۳۹ء) اور پریم جموں (۱۹۴۳ء) کے قیام نے ریاستی اردو ادیبوں کے دو دبستانوں کو قائم کر کے اُردو ادب خصوصاً ادبی نثر کے فروغ کے مزید امکانات کو روشن کیا۔ یہ دبستان رنبیر اسکول آف اردو رائٹرس اور کشمیر اسکول آف اُردو رائٹرس تھے۔ کشمیر اسکول ریاست کے نامور ہفتہ وار اخبار چاند جموں کی پیداوار تھا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دنوں میں ریاست کی ادبی فضا کو مستحکم کرنے میں بزمِ سخن جموں کا کردار بھی نہایت اہم رہا۔

اس دور میں تنقید اور ادبی تاریخ کا ایک نادر نمونہ محمد عمر نور الٰہی کا معرکہ آرا کام ناٹک ساگر ہے جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ ڈرامے کی عالمی تاریخ کا یہ نادر نمونہ ہے جس کا جواب آج تک کسی سے ممکن نہ ہو سکا۔

اُردو ادبی نثر کی ترقی میں محمد دین فوق کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کا خاندان کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب چلا گیا تھا لیکن کشمیر سے آپ کا تعلق تا حیات قائم رہا۔ آپ کی متعدد تصانیف ریاست کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بناتی ہیں۔ ریاست میں ادبی ذوق کو مستحکم کرنے کے لئے آپ کی کوششوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

کشمیر کے نامور شاعر مہجور نے بھی اُردو نثر میں ایک سوانح حیات مرتب کی جس کا عنوان حیاتِ رحیم ہے۔ اس میں آپ نے عبدالرحیم شاہ صاحب قلندر صفا پوری کے حالاتِ زندگی اور کشف و کرامات کا ذکر کیا ہے۔

جناب سعد الدین چشتی نے بھی یاداشتیں مرتب کی تھیں جو تاریخِ کشمیر پر روشنی ڈالتی ہیں۔

آزادی کے بعد ریاست میں اُردو ادبی نثر نے مختلف نثری اصناف کی صورت میں ارتقاء پایا جن میں ڈراما، افسانہ، انشائیہ، طنز و مزاح، تنقید و تحقیق، تاریخ ادب، سفر نامہ، یاداشت ڈائری اور رپورتاژ شامل ہیں۔

جہاں تک ریاست میں ڈرامے کی روایت کے پروان چڑھنے کا تعلق ہے شاعری کے بعد اُسے اس اعتبار سے اوّلیت کا درجہ حاصل ہے کہ اس کے نشانات یہاں بھانڈوں کی نقلوں کی صورت میں ہمیں قدیم زمانے سے ملنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر برج پریمی نے اورنگ زیب کے زمانے

میں پائے جانے والے کچھ کشمیری بھانڈوں کا ذکر کیا ہے جو گانے بجانے اور سوانگ رچانے کے فن میں ماہر تھے اور امراء اور وزرا کی محفلوں میں اپنے کرتب دکھایا کرتے تھے۔ اسی فن کو بھانڈ پاتھر کا نام بھی دیا جاتا تھا۔ یہ دراصل ایک قسم کا عوامی ڈراما تھا۔ جس کا طنز و مزاح کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ اسے کشمیر میں چلتا پھرتا اسٹیج بھی کہا جا سکتا ہے۔

جموں میں بھی ڈرامے کی روایت کو رام لیلا کی روایت نے محفوظ رکھا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے جب پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کی ریاست خصوصاً جموں میں آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو ڈرامے کی روایت کے فروغ کے مزید امکانات پیدا ہو گئے۔ یہ تھیٹریکل کمپنیاں یہاں بھی حکومت کی سرپرستی میں آغا حشر کاشمیری، بیتاب بنارسی، طالب بنارسی، ماسٹر رحمت علی اور احسن لکھنوی کے لکھے ڈرامے پیش کرتی رہیں۔

ان سرگرمیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست میں بھی ایسے ادیب پیدا ہو گئے جنھوں نے ڈرامے تخلیق کر کے پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان میں محمد عمر نور الٰہی، عزیز کاشمیری، جگدیش کنول، آذر عسکری، نرسنگداس نرگس، ایم اے عزیز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان ادیبوں نے آزادی سے قبل ڈرامے کی روایت کو فروغ دے کر اردو ادبی نثر کو پروان چڑھایا۔

اسی زمانے میں خطۂ کشمیر کے دینا ناتھ وار یکو شاہد کے ایک اسٹیج جس کا عنوان "زخمی ہرن" تھا کا بھی پتہ چلتا ہے جو مارتنڈ اخبار میں بالاقساط شائع ہوا۔ (برج پریمی)

بیسویں صدی میں تھیٹریکل کمپنیوں کے زیرِ اثر گاؤ کدل میں ایک اسٹیج کے قیام کی روایت کا بھی ذکر ملتا ہے جس نے کشمیر میں راس لیلا طرز کے ڈرامے کی پیش کرنے کا سلسلہ شروع کر کے اردو ادبی نثر کو فروغ دیا۔ لیکن یہ تھیٹر زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ اس کا اجراء دھرم ارتھ کے تحت ہوا تھا۔

محمد عمر نور الٰہی جن کا ذکر اُوپر ہوا مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی قائم کردہ ڈراما کلب سے بھی وابستہ تھے بلکہ وہ اس کلب کے ڈائریکٹر اور ایکٹر تھے۔ آپ نے نہ صرف ڈرامے تخلیق کر کے پیش کئے بلکہ ڈراموں کے تنقیدی جائزے بھی لکھے۔

"محمد عمر نور الٰہی صاحبان بیسویں صدی کے ربع اوّل میں جموں کے ادبی حلقوں کے روحِ رواں تھے۔ اُن کا سب سے پہلا نمایاں کام حکیم احمد شجاع کے ڈرامے "باپ کا گناہ" پر تنقید تھی جس میں کئی ارتقائی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس تبصرے کی بدولت وہ ادبی دنیا میں ایک سنجیدہ

نقاد کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ اس کامیابی نے اُنھیں آغا حشر کاشمیری، احسن مارہروی، محشر اور رحمت علی کے ڈراموں کا تنقیدی جائزہ لینے کی طرف مائل کیا اور یہ تنقیدیں بھی اہمیت کی نظر سے دیکھی گئیں۔ (راقم کا مضمون صوبہ جموں میں اُردو ڈرامے کا ارتقاء۔ بازیافت ۲۰۰۵ء ۲۰۰۶ء)

محمد عمر نورالٰہی صاحبان نے جو ڈرامے تخلیق و ترجمے کیے اُن کے عنوان درجِ ذیل ہیں۔

(۱) تین ٹوپیاں...... مزاحیہ ڈرامے، فرانسیسی زبان سے ماخوذ۔

(۲) بگڑے دل...... مولیر کے طربیئے مس انتھروپ کا ترجمہ۔

(۳) اسکندر۔

(۴) قزاق...... شلر کے ڈرامے کا ہندوستانی روپ۔

(۵) موجودہ لندن کی اسرار...... لندن میں ہونے والے خفیہ جرائم سے متعلق۔

(۶) ظفر کی موت...... بلجیم کے ڈراما نگار مسٹر لنک کے ڈرامے Sister Love کا ترجمہ۔

(۷) روح سیاست...... ابراہیم لنکن کی زندگی سے متعلق۔

(۸) پہلی پیشی...... مختصر ڈراما، ہمایوں لاہور میں ۱۹۹۹ء میں چھپا۔

(۹) جانِ ظرافت...... مولیر، لیسنگ اور مرزا جعفر ایرانی کے ڈراموں کا ملا جلا روپ۔

(۱۰) خوابِ پریشان۔ سویڈن کے ڈراما نگار سوسیو سٹارین برگ کے فلسفیانہ ڈرامے کا ترجمہ۔

(۱۱) ڈرامے چند...... سات ڈراموں کا مجموعہ۔

محمد عمر کی طرح نورالٰہی نے بھی مزاحیہ ڈراموں کا ایک مجموعہ مدہم پنچم کے عنوان سے شائع کیا۔

جگدیش کنول کا ڈرامہ پردے کے پیچھے، اطہر عسکری کا چنار سنولیس، نرسنگداس نرگس کا تعارف اور ایم اے عزیز کا نوشتۂ تقدیر، بھی اس دور کے اہم ڈراموں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ بھی ڈرامے اسٹیج سے متعلق تھے۔

آزادی کے بعد ریاست میں بھی چند ایسے ادارے وجود میں آ گئے جنھوں نے اُردو ڈرامے کی وساطت سے اردو نثر کو ترقی دی۔ ان میں سرکاری اور خود مختار دونوں قسم کے ادارے شامل ہیں۔ ۴۷۔۱۹۴۸ء میں جب ریاست میں ریڈیو کشمیر کے نام سے جموں اور سرینگر میں دو ریڈیو اسٹیشن قائم کیے گئے تو دوسری اصناف کے ساتھ ہی ساتھ اُردو ڈرامے کو بھی فروغ ملنے کے امکانات پیدا ہو گئے اس طرح ڈرامے کے میدان میں ریڈیائی ڈرامے کے عنوان سے ایک نئی

صنف وجود میں آگئی۔ اس صنف کو جن ڈراما نگاروں نے پروان چڑھایا اُن میں پردیسی، اختر محی الدین، سوم ناتھ زتشی، رام کمار ابرول، ٹھاکر پونچھی، سکھ دیو سنگھ، علی محمد لون، نرہری رائے زادہ، پشکر ناتھ، زیڈ سیمی، وجے سمن، وجے سوری، بنسی نردوش، جتندر شرما، دینو بھائی پنت، نریندر کھجوریا، وید راہی، شبنم قیوم، منیش شرما، خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

ریڈیو کشمیر سرینگر نے جشنِ تمثیل کے عنوان سے ریڈیو ڈراموں کے مقابلوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جو ایک عرصے تک جاری رہا۔ ان کوششوں نے جہاں ریڈیائی ڈراموں کے فن کو ریاست میں فروغ دیا وہاں اُردو ادبی نثر کو بھی نئے آفاق سے روشن کیا۔ اُردو میں مکالماتی نثر کے ارتقاء کا سہرا انہی کوششوں کی دین ہے۔

ریاستی کلچرل اکیڈیمی بھی ہر سال اسٹیج ڈراموں کے مقابلے منعقد کرتی ہے جس کی وجہ سے بھی اُردو اسٹیج ڈرامے نے ترقی کی نئی منزلیں طے کی ہیں۔ اپٹا کی تحریک کے زیرِ اثر بھی پران کشور اور دوسرے ساتھیوں نے اُردو ڈراموں کو آگے بڑھایا۔ گزشتہ تیس سال کے دوران جن ڈراما نگاروں نے ریڈیائی اور اسٹیج ڈراموں کے ارتقا میں قابلِ قدر کردار ادا کیا ہے اُن میں مشتاق کاک، پروفیسر ظہور الدین اور آنند لہر قابلِ قدر ہیں۔

ریاست میں تحقیق وتنقید کی روایت کا آغاز بھی ڈوگرہ حکمرانوں کے دور میں ہی ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تحقیق وتنقید کو ابھی دو الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا۔ اسی لئے اُس زمانے کے مضامین میں ان دونوں کے عناصر گھلے ملے نظر آتے ہیں۔

ابتداً اس طرح کی تحریریں ریاست سے باہر چھپنے والے اخباروں میں چھپتی رہیں۔ ان اخباروں میں لاہور سے چھپنے والے اخبار کوہِ نور، زمیندار، اخبارِ عالم، پیسہ اخبار، کشمیری درپن وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں چھپنے والے مضامین زیادہ تر تاثراتی، تجزیاتی اور معلوماتی نوعیت کے ہوتے تھے۔ جن کے ذریعے مضمون نگار کا مقصد کسی تحریر کے بارے میں اپنے تاثرات کو قارئین تک پہنچانا یا مصنف کی سوانح کوائف سے آگاہ کرنا ہوتا تھا۔

ریاست میں اُردو نثر کو ایک نئے اسلوب سے متعارف کرنے کا با قاعدہ کام مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں انجام پذیر ہوا۔ چنانچہ تحقیق وتنقید کی با قاعدہ روایت کا آغاز بھی بدیا بلاس اخبار سے ہوا جس میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی قائم کردہ پہلی ادبی انجمن بدیا بلاس سبھا کی سرگرمیوں کی

تفصیلات تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اس سبھا کے اراکین میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے علماء شامل تھے جنھیں مہاراجہ نے ملک کے مختلف مقامات سے بلا کر اس لئے اپنے دربار اور بدیا بلاس سبھا سے وابستہ کیا تھا کہ ریاست کے اندر علمی و ادبی فضا کو بہتر بنا کر عوام کو اُس سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے۔ ان سرگرمیوں کی نوعیت تحقیقی و تنقیدی دونوں تھی۔ سبھا کے اجلاسوں میں جہاں بحث و تمحیص کے دوران کسی علمی و ادبی فن پارے اور اُس کے ادیب کے سوانحی کوائف کو شواہد کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا وہاں اُس فن پارے کے ترجمہ ہونے سے ریاستی عوام کو کیا فائدہ ہونے والا ہے اُس کا بھی تفصیل سے ذکر کیا جاتا تھا۔

ریاست میں اُردو تحقیق و تنقید کو مزید فروغ اُن حضرات کے ہاتھوں حاصل ہوا جو اپنے فرائض منصبی انجام دینے یا علمی و ادبی محفلوں میں شریک ہونے کے لئے یہاں وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ ان حضرات میں پنڈت برج موہن دتہ تریہ کیفی جو ریاست کے اسسٹنٹ فارن سیکریٹری بن کر آئے، نواب جعفر خان اثر جو بطورِ وزیر یہاں کام کرتے رہے اور حفیظ جالندھری جو کسی نہ کسی صورت میں ریاستی ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہی نہیں تحریکِ آزادی کی بھی حمایت کرتے رہے۔ فیض احمد فیض نے بھی ان سرگرمیوں کو تقویت پہنچائی۔ خلیفہ عبدالحکیم، عبدالسمیع پال، اثر صہبائی، خوشی محمد ناظر اور محمد دین تاثیر بھی جو ملازمت کے سلسلے میں یہاں مقیم تھے اردو تحریک اور تحقیق و تنقید کی سرگرمیوں کو تقویت پہنچاتے رہے۔ احسان دانش اور روشن صدیقی بھی یہاں آکر ادبی محفلوں میں حصہ لیتے رہے۔ محمد دین فوق کی تحقیقی و تنقیدی تحریروں نے بھی بیسویں صدی کے آغاز میں اس روایت کو فروغ دیا۔

منشی سراج الدین جو اقبال کے ہم عصر تھے اُن کے اُس تنقیدی مضمون کا بھی پتہ چلتا ہے جو اُنھوں نے اسرارِ خودی پر لکھا اور گلریز میں شائع ہوا۔

۱۹۱۲ء میں بزم سخن جو بعد میں بزم ادب جموں کے نام سے منسوب کی گئی اور ۱۹۲۴ء میں رنبیر سنگھ کے اجرا نے ان تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کو مہمیز کیا۔ اب تک جو ادبی کاوشیں ریاست سے باہر چھپنے والے اخباروں میں شائع ہوتی تھیں اب یہیں پر شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کرنے لگیں۔ رنبیر کے ادارے نے جلد ہی رتن جموں کے نام سے ایک رسالہ پہلے بچوں کے لئے اور پھر سب کے لئے جاری کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا، اس ادارے کے گرد ادیبوں کا ایک ایسا حلقہ قائم ہو گیا

جس کو دبستانِ رنبیر کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس سے تنقیدی و تحقیقی سرگرمیوں میں بڑی تیزی آئی ۔ اب صرف اصنافِ ادب پر ہی مضامین شائع نہیں کیئے گئے بلکہ کلاسیکی فن پاروں سے بھی شائقین ادب کو روشناس کیا جانے لگا۔

ان سرگرمیوں نے ریاست میں اُس تحقیقی و تنقیدی مذاق کو پروان چڑھایا جس نے محمد عمر نور الہیٰ صاحبان کو برسوں کی محنت کے بعد ناٹک ساگر جیسی تحقیقی و تنقیدی معرکہ آرا کتاب پیش کرنے کے قابل بنایا۔ یہ کتاب ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی جس پر مہاراجہ جابہادر نے مصنفین کو ڈھائی سو روپے کے انعام سے نواز۔ یہ اُردو زبان میں وہ پہلی تصنیف ہے جس میں دنیا بھر کے ممالک میں ڈرامے کے آغاز وارتقاء کے ساتھ ہی ساتھ دنیا کے بڑے ڈراما نگاروں کی سوانح اور ادبی خدمات خصوصاً اُن کے ڈراموں کا تفصیل سے تحقیقی، تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ تحقیقی اعتبار سے اس میں یقیناً بہت سے جھول ہیں۔ مثلاً یہ پتا نہیں چلتا کہ مصنفین نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کی ہیں۔ اُن کے مآخذ کیا ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پیش کی گئی معلومات صحیح ہیں۔ ان کی تنقیدی آراء سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن تحقیقی آراء سے اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے۔

چاند جموں کے ادارے سے جاری ہونے والے ماہنامہ پریم جموں کے گرد جمع ہونے والے اُردو ادیبوں، جن کو کشمیر اسکول آف اردو رائٹرس کا نام دیا گیا، نے بھی تحقیقی و تنقیدی سرگرمیوں کو مستحکم کرنے کا کام کیا۔ کشمیر میں یہ کام پریم ناتھ بزاز کے وتستا (۱۹۳۳ء) پنڈتوں کی تنظیم یووک سبھا کے ''مارتنڈ'' اور دوسرے اخباروں نے انجام دیا۔

ریاستی اُردو ادبی نثر کی وساطت سے تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کے فروغ کا جہاں تک تعلق ہے۔ چاند کے ادارے سے جاری ہونے والے ماہوار رسالے پریم جموں کا کردار نہایت اہم ہے۔ اس میں تحقیقی و تنقیدی مضامین چھپتے رہے اور اُردو کے جن ادیبوں نے پہلے خصوصاً نام کمایا اُن میں حنیف ہاشمی، بی ڈی بل شرما، دیا کرشن گردش، عبدالحمید نظامی، گلزار احمد فدا، محمد شبیر اور ڈاکٹر محمود راضی قابل ذکر ہیں۔ پریم جموں میں مہندی، اُردو اور سنسکرت ادب کے مختلف پہلوؤں پر متعدد مضامین شائع ہوئے۔ کالی داس کے متعدد ڈراموں کا جائزہ لیا گیا۔ ''غزل کی تدریجی ترقی'' اور ''نثر کی تدریجی ترقی'' کے عنوان سے محمد شبیر کے دو مضامین شائع ہوئے۔ اسی زمانے میں جناب عبدالاحد آزاد نے کشمیری زبان اور شاعری اور نندلال طالب نے بہارِ گلشن کشمیر پر تبصرہ لکھ کر تحقیق و تنقید کے

سفر کو آگے بڑھایا۔

"تقسیم ملک اور اُس کے بعد فسادات نے تحقیقی وتنقیدی سرگرمیوں کو بھی متاثر کیا اور کچھ دیر کے بعد تعطل کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ لیکن ۱۹۵۰ء تک پہنچتے پہنچتے بادل چھٹنے لگے۔ چنانچہ تحقیقی وتنقیدی تحریریں بھی اخباروں میں نظر آنے لگیں۔ اخباروں میں چاند اور سندیش اور رسائل میں سنگم، شیرازہ، نوری چھم اور دھنک نے اس سلسلے میں قابلِ قدر کردار ادا کیا۔

اس شیرازہ بندی میں پشکر ناتھ، عرش صہبائی، ہر بھگوان شاد، موہن یاور، اور نند کمار باوا کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ ادیب چوں کہ بنیادی طور پر تخلیقی ادیب تھے اس لئے تحقیق کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ اس کے باوجود عرش صہبائی کی تین کتابیں جن کے عنوانات انجم کدہ (۱۹۶۳ء) یہ جانے پہچانے لوگ (۱۹۶۶ء) اور مختلف شعراء کے تذکرے (۱۹۶۸ء) میں کسی حد تک تحقیقی وتنقیدی روایت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ان میں ریاست کے شعراء کے سوانحی کوائف کے علاوہ اُن کی ادبی وشعری کارکردگی کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

ادبی انجمنوں کے قیام نے بھی اس سفر کو تقویت پہنچائی۔ اُن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام نیک فال ثابت ہوا۔ پردیسی، ماسٹر زندکول، مہجور، اور عارف نے اس کے تحت کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ریڈیو کشمیر جموں (۱۹۴۷ء) اور ریڈیو کشمیر سرینگر (۱۹۴۶ء) کی خدمات کو بھی اس سلسلے میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان دونوں نے بھی تخلیقی ادب کے ساتھ ہی ساتھ تحقیقی وتنقیدی روایت کو بھی مستحکم کیا۔

اُردو تحقیق وتنقید کے کام کو صحیح معنوں میں شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی اور شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی نے فروغ دیا۔ ان اداروں کے ساتھ اُردو کے اہم محققین وناقدین نے وابستہ ہو کر اپنے اپنے کارہائے نمایاں انجام دیئے جنھیں اُردو دنیا میں ہمیشہ قدر کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ پروفیسر محی الدین قادری زور، پروفیسر شکیل الرحمن، پروفیسر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر محمد زماں آزردہ، ڈاکٹر قدوس جاوید، ، ڈاکٹر نذیر ملک، ڈاکٹر مجید مضمر نے کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ رہ کر متعدد تحقیقی وتنقیدی کام کئے۔ کچھ کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں۔

حامدی کشمیری:۔ جدید اُردو نظم پر یورپی اثرات، غالب کے تخلیقی سرچشمے، نئی حثیت اور عصری اُردو شاعری، غالب اور اقبال، کارگہہ شیشہ گری، ناصر کاظمی کی شاعری، معاصر تنقید ایک

تناظر میں، تفہیم وتنقید، جدید شعری منظر نامہ، حال ہی میں حامدی نے اکتشافی تنقید کے عنوان سے ایک نئے تنقیدے نظریئے کو پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری:- میر انیس بحیثیتِ رزمیہ شاعر، مطالعہ زور، میر ضمیر، تحقیق وتنقید، مضامینِ حیدری اور دیوانِ میر۔

ڈاکٹر برج پریمی:- سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے، حرف و جستجو، جلوۂ صدرنگ، منٹو کتھا، ذوقِ نظر، جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما، چند تحریریں اور مباحث۔

ڈاکٹر محمد زمان آزوردہ:- سلامت علی دبیر، حیات اور کارنامے،

ڈاکٹر قدوس جاوید:- ادب اور سماجیات۔

ڈاکٹر نذیر ملک:- کشمیری سرمایۂ الفاظ کے سرچشمے، اُردو رسم خط، ارتقاء اور جائزہ۔

ڈاکٹر مجید مضمر:- اُردو کا علامتی افسانہ، رنگ باتیں کریں، کشمیری ڈراما، کشمیری فکشن۔

تحقیقی وتنقیدی اُردو نثر کے ارتقاء میں کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسی چیوٹ کی خدمات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اس ادارے سے اُردو دنیا کی نامور ہستیاں وابستہ رہی ہیں جن میں پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر عالم خوندمیری، پروفیسر مسعود حسین خاں اور پروفیسر محمد امین اندرابی شامل ہیں۔ تفہیمِ اقبال کے سلسلے میں اس ادارے سے متعدد تحققی وتنقیدی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ جنھیں برصغیر ہی میں نہیں باہر بھی استناد کا درجہ حاصل ہوا ہے۔

شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی کا قیام ۱۹۶۵ء میں عمل میں آیا۔ پروفیسر ڈاکٹر گیان چند جین اس شعبے کے صدر تھے۔ اس شعبے کے جن اساتذہ نے تحقیقی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اُردو نثر کو ترقی کی نئی منزلوں سے ہمکنار کیا اُن میں ڈاکٹر جین کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر شام لال کالرا (عابد پشاوری) پروفیسر ڈاکٹر منظر اعظمی (عنایت اللہ منظر) پروفیسر ظہور الدین، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور اسد اللہ وانی قابلِ ذکر ہیں۔ ان محققین کی درج ذیل کتب کو اس سلسلے میں خاص طور سے پیش کیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر گیان چند جین:- اُردو مثنوی شمالی ہند میں، اُردو کی نثر داستانیں، تحقیق کا فن، لسانی مطالعے۔

پروفیسر ڈاکٹر شام لال کالرا عابد پشاوری:- انشا اللہ خان انشا دہلوی، حیات، شخصیت اور اُردو نثر میں اُن کا حصہ، نقطے اور شوشے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد:- اقبال اور اُس عہد، اقبال اور مغربی مفکرین، نشانِ منزل۔

پروفیسر ڈاکٹر عنایت اللہ منظر اعظمی:۔ اُردو میں تمثیل نگاری، اُردو کی اصلاحی تحریکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر ظہور الدین: بیسویں صدی کے اُردو ادب میں انگریزی کے ادبی رجحانات، جدید اُردو ڈرامے، حقیقت نگاری اور اُردو ڈراما، جدید ادبی تنقیدی نظریات، کہانی کا ارتقاء۔

Developement of Urdu Language and Litrature in Jammu Region

پروفیسر ڈاکٹر خورشید احمد صدیقی۔ پروفیسر ڈاکٹر نصرت آراء چودھری اور پروفیسر ڈاکٹر ضیا الدین کے ہاں بھی تحقیقی وتنقیدی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ طلبہ میں ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا، ڈاکٹر محمد لطیف میر، ڈاکٹر مہندر لال پروانہ، ڈاکٹر مشتاق وانی، ڈاکٹر مشتاق قادری، ڈاکٹر عبدالحق نعیمی اور ڈاکٹر شاہ نواز کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔

اُردو تحقیق وتنقید کو فروغ دینے میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی کا کردار بھی قابلِ ستائش ہے۔ اکیڈیمی نے رسالہ شیرازہ کی وساطت سے اردو تحقیق وتنقید کو مستحکم کرنے کا کام تو کیا ہی اس کے علاوہ کتابیں لکھوا کر یا اُن کی اشاعت کے لئے مالی امداد فراہم کر کے بھی اس کے فروغ کے امکانات روشن کئے۔ اکیڈیمی کے کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اُس کا بیان کرنا ممکن نہیں ہے (تفصیل کے لئے راقم کے مضمون، ریاست جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید مطبوعہ، بازیافت جشنِ زریں نمبر دیکھئے)۔

ریاستی ادیبوں کی نجی کوششوں نے بھی اُردو تحقیق وتنقید کو آگے بڑھانے میں قابلِ قدر کردار ادا کیا ہے۔ ان کوششوں میں جناب عارف بیگ، محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر مرغوب بانہالی، خالد بشیر احمد، اسیر کشتواڑی اور جناب غلام نبی خیال کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ نوجوانوں میں نذیر آزاد اور شفق سوپوری قابلِ ذکر ہیں۔

شاعری کے بعد جس صنفِ ادب کو ریاست میں زیادہ توجہ حاصل ہوئی وہ افسانہ ہے۔ اسی کی وساطت سے اُردو نثر کو رومانوی وحقیقت نگاری کے عناصر سے مملو ہونے کا موقع ملا۔ ریاستی اُردو افسانہ یہاں بھی اُن عناصر ترکیبی سے آشنا ہوا جن سے وہ ملکی سطح پر روشناس ہو چکا تھا۔

ریاستی عوام میں جیسے جیسے ادبی ذوق پروان چڑھتا گیا، داستان، ناول اور افسانے سے اُن کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ اشاعت کی سہولیات میسر نہ ہونے کی وجہ سے ابتداء میں اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے شائقین ادب نامور داستانوں، ناولوں اور دوسری کہانیوں کی نقول تیار کر کے اُن کا

مطالعہ کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے ریاست کے مختلف علاقوں میں لوگوں کی نجی لائبریریوں میں ایسی نقول مل جاتی ہیں جو انیسویں اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں تیار کی گئیں۔

اُردو افسانے کا جہاں تک تعلق ہے اُس کے بارے میں ابتدائی معلومات ہمیں ریاست کے پہلے اُردو اخبار رنبیر جموں کے کالمز سے مل جاتی ہیں۔ جن میں وقتاً فوقتاً ایسی مختصر کہانیاں چھپتی نظر آتی ہیں جنھیں افسانے کے ابتدائی روپ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کہانیوں پر محمد حسین آزاد کے تمثیلی اسلوب کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ رنبیر کے ۲۴ء ۱۹۲۵ء کے فائل میں اسی طرح کی ایک کہانی ۱۵ر اگست ۱۹۲۴ء کے شمارے میں "مسیرِ ہستی" کے عنوان سے چھپی مل جاتی ہے۔ جس میں تمثیلی انداز میں رنبیر اخبار کی تعریف و توصیف میں دریا بہائے گئے ہیں۔ رنبیر ہی اس افسانے کا ہیرو ہے۔

ملک گیر اصلاحی تحریکوں کے زیر اثر جب یہاں بھی مختلف سماجی تنظیمیں وجود میں آگئیں اور اُنھوں نے سماجی برائیوں کے انسداد کے لئے کوششیں کرنا شروع کیں تو افسانے نے بھی اُن کی ہم نوائی کرنے کی ٹھانی اور اس طرح مختلف اصلاحی افسانے وجود میں آگئے۔ یہ اصلاحی واخلاقی افسانے بھی رنبیر کے مختلف شماروں میں شائع ہوتے رہے۔ اس دور کے کچھ اصلاحی افسانوں کے عنوانات درجِ ذیل ہیں۔

(۱) ماں از مدیر رنبیر جموں ......۲۷ر ستمبر ۱۹۲۸ء کا شمارہ

(۲) پشچاتاپ از شری ڈوگرا ......۱۸ر اکتوبر ۱۹۲۹ء

(۳) موہنی از ستکل حبسراج ......۲۹ر اکتوبر اور ۵ر نومبر ۱۹۲۹ء

(۴) دلاور چور از مدیر رنبیر ......۱۳ر نومبر ۱۹۲۹ء

(۵) شہیدِ وطن ......۲ر دسمبر ۱۹۲۹ء

(۶) قربانی از کے ایل ورما ......۳ر فروری ۱۹۳۰ء

(۷) کرنی کا پھل از اقبال ......۴ر جولائی ۱۹۳۲ء

(۸) پیا کی جوگن از نشاط جوئیوی ......۲۴ر اگست ۱۹۳۲ء

(۹) اٹھنی کا چور از ڈاکٹر کے ایس چودھری ......۳۱ر اگست ۱۹۳۲ء

(۱۰) قمار باز از نشاط جوئیوی ......۲۴ر نومبر اور دسمبر ۱۹۳۲ء

(۱۱) انتقام از اننت رام ورما ......۲۴ر مئی ۱۹۳۳ء

(۱۲) وطن پرست از مہاشا روشن لال گپتا...... ۱۷ ر دسمبر ۱۹۳۴ء

یہ صرف چند کہانیوں کے نام ہیں ورنہ اس دور میں چھپنے والی کہانیوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ رنبیر کا شائد ہی کوئی شمارہ ایسا ہو جس میں ایک دو کہانیاں یا افسانے نہ چھپتے ہوں۔

ترقی پسند تحریک کے اثرات نے یہاں بھی اُردو افسانے کو فنی و موضوعاتی اعتبار سے نئے آفاق سے ہمکنار کیا۔ اس کے زیرِ اثر ریاست میں بھی متعدد ایسے افسانہ نگار ابھر آئے جنھوں نے اُردو افسانے کو فکری و فنی دونوں اعتبار سے بے پناہ وسعت عطا کی۔ اس دور (۱۹۳۵ سے ۱۹۴۷ء تک) کے اہم افسانہ نگار حسب ذیل تھے۔

نشاط جوئیوی، ساگر چند، سدرشن، دولت رام گپتا، عشرت کاشمیری، پروفیسر محمود ہاشمی، آذر عسکری، محمد عمر نور الہیٰ، کنول نین پرواز، محمود راضی، آوارہ زمزمی، شریف حسن کاظمی، فیض صدیقی راجوروی، رام لال مہتا، جگدیش کنول، عزیز پرکاش، انور نقوی، عجوبہ، سورج پرکاش بخشی، ٹھاکر پونچھی، یاسمین، عبدالعزیز علائی، طالب گورگانی، اقبال تمنائی، گلزار احمد فدا، کوثر سیمابی، نرسنگداس نرگس، موہن یاور، بملا گپتا، حمیدہ فضل کریم اور رانا نظامی۔

ان افسانہ نگاروں نے زندگی کے متنوع مسائل کو موضوع بنا کر سماج میں پھیلی ناہمواریوں پر تازیانے برسائے۔ فنی اور لسانی اعتبار سے بھی حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا۔ اس زمانے میں اُردو افسانے کو جس نے فنی و موضوعاتی اعتبار سے سب سے زیادہ پختگی اور تنوع عطا کیا وہ پنڈت پریم ناتھ پردیسی ہے۔ اُن کے ابتدائی افسانوں میں ادبِ لطیف کا رنگ نظر آتا ہے لیکن بعد میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر اُنھوں نے بھی اپنے دور کے مسائل کو برتنا شروع کیا...... بعد اُن کے اکثر افسانوں کا اندازہ بدلا نظر آتا ہے ۱۹۳۸ء کے اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

"۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک جو کچھ میں نے لکھا تھا اُس پر میں فخر نہیں کر سکتا...... اُس وقت تک مجھے احساس ہی نہ تھا کہ ایک افسانہ نگار ہونے کی حیثیت سے مجھ پر اپنے وطن کے کیا فرائض ہیں۔"

(کشمیر میں اُردو: جلد دوم ۴۳۵)

شام وسحر ہماری دنیا اور بہتے چراغ اُن کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے اور افسانے ریاستی اخباروں میں بکھرے پڑے ہیں۔

اسی زمانے میں ایک اور افسانہ نگار تیرتھ نے بھی افسانے لکھے وہ نہ صرف زندگی کے ہر پہلو

پر قلم اُٹھاتے ہیں بلکہ اسالیت برتنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

پنڈت دینا ناتھ وار یکو شاہد کاشمیری نے بھی "ملاپ، بکھان اور جواب" کے عنوان سے افسانے لکھے۔ان سبھی پر ظرافت کا رنگ غالب ہے۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی دہے میں کشمیر میں کئی افسانہ نگار ابھرے جن میں پنڈت شیام لال، کبویا کابو، عارض کاشمیری اور گوپی ناتھ مٹو قابلِ ذکر ہیں۔

ملک کی تقسیم اور فسادات نے اُردو افسانے کی دنیا میں بھی تعطل کی کیفیت پیدا کی۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے آس پاس جب یہ گرد و غبار چھٹنے لگا تو دوسری اصناف کی طرح افسانے کی طرف بھی توجہ دی گئی۔اس دور میں جن موضوعات نے افسانوں میں جگہ پائی وہ غربت، بے سروسامانی، مایوسی، انسانی دکھ درد، اقدار کا زوال اور انسانی اقدار کی پامالی ہیں۔اسی طرح انسانی رشتوں کا انہدام، حیوانیت کا عروج، انسانی زندگی کی بے معنونیت اور غیر یقینی کو بھی افسانوں میں جگہ دی گئی۔سماجی نابرابری، جمہوری اقدار کا زوال یا اُن کی ناکامی اور انسان کے بگڑتے ہوئے حالات نے بھی افسانوں میں جگہ پائی۔ نئے نظام سے جو توقعات وابستہ کی گئیں تھیں جب وہ پوری نہ ہوئیں تو مایوسی نے پورے سماج کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ظلم، ناانصافی اور غربت پھیلتی جا رہی تھی۔عام انسان یہ دیکھ کر حیران تھا کہ یہ وہی نظام ہے جس کی خاطر اُس نے نہ صرف جدوجہد کی تھی بلکہ سب کچھ قربان بھی کیا تھا۔چنانچہ افسانہ نگاروں سے ان تمام موضوعات کو افسانوں میں پیش کیا۔اس دور کی موثر آوازیں حسب ذیل تھیں:

نرسنگداس نرگس، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، مالک رام آنند، پشکر ناتھ، نور شاہ، حامدی کاشمیری، رام کمار ابرول، وجے سوری، کرن کاشمیری، نند کمار باوا، کشوری منچندہ، وید راہی، علی محمد لون، اختر محی الدین، بنسی نردوش، غلام رسول سنتوش، زید سیمی اور برج پریمی۔

ان کے افسانوں کے جو مجموعے مشہور ہوئے اُن کی فہرست طویل ہے۔صرف چند نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں:

موہن یاور: وسکی کی بوتل، تیسری آنکھ، دو کنارے۔

مالک رام: جانے وہ کیسے لوگ تھے۔

پشکر ناتھ: اندھیرے اجالے، ڈل کے باسی، عشق کا چاند اندھیرا۔

کرن کاشمیری: ادھورے سپنے۔

وجے سوری: آخری سودا۔

۱۹۶۰ء کے بعد ریاست میں بھی افسانہ نگاروں کی ایک نئی کھیپ نمودار ہوئی ہے جو ملک گیر سطح پر ہونے والے تجربوں سے استفادہ کر کے یہاں بھی علامتی، تجریری شعور کی رو کے تجربے کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں عمر مجید، ورنید پٹواری، اوپی سارتھی، ایس سروج، ڈی کے کنول، راجیش گوہر، جوتیشور پتھک، شبنم قیوم، خالد حسین، آنند لہر اور ظہور الدین قابلِ ذکر ہیں۔

ریاست میں اُردو افسانے کا سفر جاری ہے اور اُسے نئے آفاق سے ہم کنار کرنے کی کوشش کرنے والوں میں کچھ اور لوگ بھی ابھر آئے ہیں۔ اُن میں انیس ہمدانی، سومناتھ ڈوگرہ، راجہ نذر بونیاری، مسعود ساموں، جان محمد آزاد، فاروق رینزو، زاہد مختار، کے ڈی مینی وغیرہ اہم ہیں۔

جہاں تک ناول کے ذریعے اردو نثر کو فروغ دینے کا تعلق ہے اس طرز کی ابتدائی کوششیں ہمیں انیسویں صدی میں ہی ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ گو اُنھیں پورے طور پر ناول کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ سالگرام سالک کا تحفہ سالک ڈپٹی نذیر کے مراۃ العروس کے تتبع میں لکھے جانے کے باوجود ناول نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اسی طرح محمد دین فوق کے ناول ریاست سے باہر لکھے گئے۔ اس لئے اُنھیں اس مطالعے کا حصہ بنانا درست نہیں۔ اس سلسلے کی اوّلین کوششیں اگر کسی کو قرار دیا جاسکتا ہے تو وہ موہن لال مرواہ کا ناول داستانِ محبت (۱۹۲۴ء) اور پنڈت شمبھوناتھ نظر کا ناول "بیوہ کی فریاد پر نظر کی اپیل" ۱۹۲۴ء) ہیں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے کے دور میں ہمیں پریم ناتھ پردیسی کے ایک ناول "پوتی" کا بھی پتہ چلتا ہے جو لاہور سے شائع ہوا لیکن تقسیم کی نذر ہو جانے کی وجہ سے وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔

تقسیم کے اندوہناک واقعات سے متاثر ہو کر رامانند ساگر نے ایک ناول "فساد اور امن" کے عنوان سے لکھا۔

تقسیم کے بعد ناول کے میدان میں یہاں بھی تیزی پیدا ہوئی اور نرسنگداس نرگس، کانشی ناتھ ترچھل، کشمیر لال ذاکر اور ٹھاکر پونچھی نے ترقی دی۔ ان کے جو ناول سامنے آئے وہ حسبِ ذیل ہیں:

نرسنگداس نرگس: پاربتی اور نرملا

کانشی ناتھ ترچھل: گوری شنکر۔

کشمیری لال ذاکر: سمندر، صلیب اور وہ، انگوٹھے کا نشان، دھرتی سدا سہاگن، خون پھر خون ہے، ڈوبتے ہوئے سورج کی کتھا، چھٹی کا دودھ، چار میل لمبی سڑک، میں اُسے پہچانتی ہوں۔

تیج بہادر بھان: سیلاب اور قطرے۔

غلام رسول سنتوش: سمندر پیاسا ہے۔

علی محمد لون: شاید ہے آرزو تیری۔

حامدی کاشمیری: بہاروں میں شعلے، بلندیوں کے خواب، برف میں آگ، پرچھائیوں کا شہر۔

نور شاہ: پائل کے زخم، نیلی جھیل کالے سائے۔

مرزا موہن شرما: ایک منزل چار راستے۔

مالک رام آنند: دھکتے پھول شبنم آنکھیں، اپنے وطن میں اجنبی، نئے دل پرانے سال۔

کرن کاشمیری: خوابوں کے قافلے، رات اور زلف۔

صوفی محی الدین: بکھر گئے سب تنکے۔

فاروق رینزو: زخموں کی سالگرہ

ڈی کے کنول: کشمکش، تماشا، نیا سفر

شبنم قیوم: یہ کس کا لہو کون مرا، چراغ کا اندھیرا، پرانی ڈگر نئے قدم، جس دیش میں جہلم بہتی ہے۔

آنند لہر: تپسوی کون، سرحد کے پار، نام دیو۔

جان محمد آزاد: وادیاں بلا رہی ہیں، کشمیر جاگ اُٹھا۔

بھوشن لال بھوشن: صرف پانچ ہزار۔

وجے سوری: ایک ناؤ کاغذ کی۔

خودنوشت اور سوانحی ادب کا بھی وافر ذخیرہ ہمارے یہاں موجود ہے۔ اوپر پیش کئے تجربے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نثر کی ان اصناف نے اُردو نثر کے آفاق کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے جس سے نثر کے کئی اسالیب یہاں بھی اُبھر آئے ہیں۔ رومانی نثر اور حقیقت نگاری سے ہوتی ہوئی یہاں بھی وہ علامتی اور تجریدی نثر کی منزل تک پہنچی ہے جس سے اظہار و بیان کے نئے اسباب پیدا ہوئے ہیں۔

نور شاہ

جموں و کشمیر میں اُردو افسانہ

ریاست جموں و کشمیر میں شاعری کے بعد جس صنف ادب کو فروغ حاصل ہوا وہ افسانہ نگاری ہے، آج کے بکھرے ہوئے انسان کے لمحاتی تجربوں کے اظہار کے لئے افسانہ ایک موثر وسیلہ ہے، افسانہ تجربہ ہے، مشاہدہ ہے، احساس اور بصیرت ہے، افسانہ ایک تحریک بھی ہے۔ افسانہ صدیوں سے دُنیا کی مختلف زبانوں میں اپنے انداز اور اپنے اسلوب سے لکھا جارہا ہے اور اُس وقت تک لکھا جائے گا جب تک ہمارے تخلیقی عمل میں سماجی، معاشی، تاریخی اور تہذیبی وابستگی کی بات ہوگی۔ بستیوں اور شہروں میں جینے کے انداز بولتے رہتے ہیں، انسانی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں، سماجی قدریں اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں ظاہر ہے کہ افسانوی اسلوب میں نیا نظریہ اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ افسانہ نیا رنگ و روپ اختیار کرتا جارہا ہے، بدلتے حالات میں ریاست سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بھی بدلاؤ آچکا ہے، یہاں کی افسانہ نگاری کا آغاز اگرچہ روایتی انداز سے ہوا لیکن رفتہ رفتہ لکھنے والوں کے شعور میں بیداری پیدا ہوئی اور فن افسانہ نگاری پر اُن کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ صلاحتیں اُبھرنے لگیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی، معاشی اور اقتصادی، سیاسی اور نفسیاتی باریکیوں کی عکاسی کرنا شروع کردی ہے اور حالات و واقعات کو مقامی رنگ دیا، مقامی کرداروں کو پیدا کیا، ریاست جموں و کشمیر کی سماجی اور معاشی صورتحال کا احاطہ اپنے انداز سے کیا!

اس سے ہم سب نجوبی واقف ہیں کہ ہمارے بہت سارے افسانہ نگار اب حیات نہیں، کچھ ایسے افسانہ نگار بھی ہیں جنہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اُردو سے کیا لیکن بعد میں وہ مادری زبان کی جانب راغب ہوگئے، بعض افسانہ نگار بیرون ریاست چلے گئے لیکن اس کے ساتھ ہی نئے کہانی کار سامنے آگئے نئے جوش اور ولولے کے ساتھ، نئی قوت اور تازگی کے ساتھ اور اس

طرح جموں و کشمیر میں اُردو افسانے کا سفر جاری رہا۔

آج جب ہم ریاست جموں و کشمیر میں اُردو افسانے کی بات کرتے ہیں تو پریم ناتھ پردیسی کا نام سامنے آتا ہے شاید اس لئے کہ ریاست میں اُردو افسانے کی باقاعدہ ابتداء پردیسی سے ہوئی اگرچہ اُن سے پہلے بھی کئی افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے۔ پردیسی کے افسانوں کی اہمیت اور انفرادیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تقسیم ملک سے پہلے اور تقسیم ملک کے بعد بھی اُن کے افسانے معیاری جرائد میں شائع ہوتے رہے، انہوں نے اپنے افسانوں میں تپتے جہنم کدوں کی تصویر کشی کی، بھوک اور افلاس کا احساس دلایا۔ اُن کی کہانی ٹیکہ بٹنی ماہنامہ ہمایوں لاہور میں ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی جو اپنے دور کی ایک عظیم کہانی تھی۔ اُن کی ایک اور کہانی کیچڑ بھی ۱۹۴۶ء میں ماہنامہ ساقی میں شائع ہوئی۔ اس کہانی کے تینوں کردار جموں کی ایک فیکٹری میں کام کرنے والوں سے تعلق رکھتے ہیں، پردیسی کے تین افسانوی مجموعے شام وسحر، دنیا ہماری اور بہتے چراغ شائع ہو چکے ہیں حال ہی میں برج پریمی کی کتاب ''پریم ناتھ پردیسی۔ عہد شخص اور فنکار'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔ قدرت اللہ شہاب اگرچہ آج بھی شہاب نامہ کی بدولت یاد کئے جاتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانوں سے کیا، ماں جی، شلوار اور ایک ڈسپیچ اُن کے معروف افسانے ہیں۔ یا خدا نامی افسانہ اُن کی ایک غیر معمولی تحریر ہے۔ نرسنگھ دیو جموال اپنے دور کے قلم کاروں میں ایک عظیم مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں دیہاتی زندگی کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ تیرتھ کاشمیری نے بھی عام زندگی اور اس کے اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں کئی افسانے لکھے ہیں۔ اس دور میں پریم ناتھ در کا نام بھی سامنے آتا ہے۔ اُن کے افسانوں میں غم آلودہ اور درد بھرے ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ ''گیت کے چار بول'' نامی کہانی میں انہوں نے مچھلی فروخت کرنے والوں کی زندگی، اُن کی معاشی اور اقتصادی حالت کو پیش کر کے زندگی کے ایک تاریک رُخ سے پردہ سرکایا ہے۔ در صاحب کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا، اُس کے بعد اُن کا دوسرا اسانوی مجموعہ ''نیلی آنکھیں'' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ اُن کا افسانہ آخ تھو آج بھی اہم افسانوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ اُن کا افسانہ ''غلط فہمی'' لاہور سے شائع ہونے والے معروف جریدہ ادبی دنیا میں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا در صاحب کے افسانوں کا انتخاب جی۔ آر۔ حسرت گڈھا نے ''چناروں کے سائے میں'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ رامانند ساگر نے کشمیر کے

پسِ منظر میں بہت سے افسانے لکھے۔ ٹنگمرگ کے اڈے پر اور کشمیر کی بیٹی اُن کے دو مقبول افسانے ہیں، چونکہ وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے اس لئے افسانوں کی دنیا سے دور ہو گئے۔

اس دور کے بعد، افسانہ نگاروں کی ایک قبیل سامنے آ گئی۔ پہلے میں اُن افسانہ نگاروں کا نام لینا چاہوں گا جو اَب حیات نہیں۔ ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، علی محمد لون، تیج بہادر بھان، پشکر ناتھ، برج ناتھ پریمی، برج کتیال، مالک رام آنند، لیش سروج، رام کمار ابرول، وجے سوری، کلدیپ رعنا، غلام رسول سنتوش، انیس ہمدانی، محی الدین شاہ، ظفر احمد، م۔م۔ صدیق، عمر مجید، بشیر شاہ اور شمس الدین شمیم کے نام مجھے یاد آرہے ہیں۔

ٹھاکر پونچھی کی کہانیوں میں پہاڑی رومان گلاب کے پھول کی طرح شاداب نظر آتا ہے، اُن کے ناولوں کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن اُن کے صرف دو افسانوی مجموعے ''زندگی کی دوڑ'' اور ''چناروں کے چاند'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ موہن یاور اپنے افسانوں میں شہری زندگی کو منظر عام میں لانے میں کامیاب رہے۔ اُن کے افسانوں کے تین مجموعے وسکی کی بوتل، سیاہ تاج محل اور تیسری آنکھ منظر عام پر آچکے ہیں۔ علی محمد لون بنیادی طور پر ایک ڈرامہ نگار تھے لیکن وہ کہانیاں بھی لکھتے تھے، اُن کی تحریر کردہ کہانیاں آرزو کا سلسلہ لا انتہا، مان اور نالے کا بادشاہ اچھی کہانیوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ تیج بہادر بھان ایک پیدائشی قلم کار تھے، اُن کا پہلا افسانہ لال چنری تھا جو ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ بانکپن اُن کا ایک شاہکار تھا، اُن کے دو افسانوی مجموعے جہلم کے سینے پر اور عورت شائع ہو چکے ہیں۔ تیج بہادر کے نام کے ساتھ ہی پشکر ناتھ کا نام سامنے آجاتا ہے۔ پشکر ناتھ کی تحریر کردہ اوّلین کہانیوں میں کشمیر کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے، کشمیر کی روح بولتی نظر آتی ہے انہوں نے اپنی کہانیوں میں جدید تکنیک اور اسلوب کا استعمال کیا اور وہ اپنے تجربے میں کامیاب بھی رہے۔ اُن کے افسانوی مجموعے کے نام ہیں ''ڈل کے باسی، اندھیرے اُجالے اور کانچ کی گڑیا''۔ ڈاکٹر برج پریمی نے اپنی افسانوی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء میں آغا نامی کہانی لکھ کر کیا۔ اُن کی تحریر کردہ کہانیوں میں سپنوں کی شام، لمحوں کی راکھ، خوابوں کے دریچے اور میرے بچے کی سالگرہ آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ برج کتیال کی کہانیاں موت کے راہی اور نرگس کے پھول اچھی کہانیوں میں شمار ہوتی ہیں۔ عمر مجید کے افسانوں میں کشمیر اور کشمیریت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے اپنی وفات سے پہلے کشمیر کے پس منظر میں انہوں نے جو کہانیاں قلم بند کیں وہ ہر لحاظ

سے قابلِ ستائش ہیں۔ اجالوں کا گھٹاؤ اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا۔ عمر مجید کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ کلدیپ رعنا کے افسانوں کے پسِ منظر میں کشمیر کی زندگی کا فطری رنگ ہے، ادھورے خواب اُن کا افسانوی مجموعہ ہے۔ لیش سروج کا افسانوی مجموعے کا نام پیاسی زمین ہے۔ مالک رام آنند نے ۱۹۵۷ء سے لکھنا شروع کیا، اُن کے افسانوی مجموعوں کے نام ہیں ''شہر کی خوشبو'' اور ''تصویر کے پھول''......رام کمار ابرول اگرچہ کہانیاں بھی لکھتے تھے لیکن فلم اُن کی کمزوری تھی۔ وجے سوری کی کہانیوں کا مجموعہ آخری سودا کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ وہ بھی فلموں میں کام کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ غلام رسول سنتوش اگرچہ بنیادی طور پر مصور تھے لیکن وہ افسانے بھی لکھتے رہے، اُن کی کہانیاں پڑھ کر اکثر احساس ہوتا ہے کہ ہم اُن کی کہانیاں پڑھ رہے ہیں یا اُن کی بنائی ہوئی کوئی پینٹنگ دیکھ رہے ہیں، انیس ہمدانی کی تحریر کردہ کہانیوں میں آہٹ نامی کہانی کو بے حد سراہا گیا۔ م۔ م صدیق ''احساس کے گھاؤ'' نامی افسانوی مجموعہ لکھنے کے بعد اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ محی الدین شاہ اور ظفر احمد کا مشترکہ افسانوی مجموعہ ''پھول اور آویزے'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بشیر شاہ مختصر کہانیوں کی تخلیق میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انھیں مختصر افسانے لکھنے کا فن خوب آتا تھا۔ اُن کی وفات سے چند روز قبل اُن کا افسانوی مجموعہ ''شب کے سمندر'' میں شائع ہوا۔ شمس الدین شمیم کے افسانوں میں آس پاس کی معاشرتی زندگی کے سنجیدہ مسائل کا آئینہ شعور ہو جاتا ہے اُن کا ایک ہی افسانوی مجموعہ ''ویرانے'' شائع ہوا ہے۔

چند ایک خواتین افسانہ نگار بھی ہیں جو اَب حیات نہیں لیکن اپنے تحریر کردہ افسانوں کی وجہ سے آج بھی ریاست کے اُردو افسانہ میں زندہ ہیں اِن میں منظورہ اختر بھی ہیں، اُن ہی کی طرح نرگس ستارہ کا نام بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ریاست جموں وکشمیر میں چند معروف افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا آغاز اُردو افسانے لکھ کر کیا لیکن بعد میں اپنی مادری زبان میں لکھنے لگے لیکن آج بھی اُردو کے افسانہ نگاروں کے ہجوم میں اُن کا نام روشن ہے، اِن میں اختر محی الدین، سوم ناتھ زتشی، پروفیسر مدن موہن شرما، امیش کول، ہردے کول بھارتی، غلام نبی بابا، فاروق مسعودی اور دیپک کول کے نام قابل ذکر ہیں، اور بھی چند قلم کار ہیں جنہوں نے ابتدائی دنوں میں اُردو میں افسانے لکھے لیکن بعد میں اُردو کے افسانوی سین سے غائب ہو گئے۔ جو چند نام میرے ذہن میں محفوظ ہیں وہ ہیں۔

گنشام سیٹھی، پروفیسر نظام الدین شاہ، ہربھجن سنگھ ساگر، سوم ناتھ ڈوگرہ، مدن شرما، خیراتی لال زخمی، یٰسین فردوسی، بشیر گاش، نذیر احمد نظیر، مشاق بھدرواہی، نند گوپال باوا، الطاف ناوپوری، ایس۔ ایم۔ قمر اور جوتیشور پتھک۔

محمد زمان آزردہ، ذی شان فاضل، وحشی سعید ساحل، سجاد حسین اور پروفیسر مخمور حسین بدخشی بھی کسی زمانے میں افسانے لکھتے تھے بلکہ اُن کے افسانوی مجموعے شائع بھی ہو چکے ہیں، آج بھی اُن کی افسانوی تخلیقات پڑھ کر ہم اپنے ماضی میں لوٹ جاتے ہیں۔ آج بھی پروفیسر ریاض پنجابی کی بہت عرصہ پہلے قلم بند کی گئی کہانیاں یاد آتی ہیں۔ اس طرح اٹین بنجارہ کی تحریر کردہ کہانیوں کو بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ویدراہی کی خوبی یہ ہے کہ وہ آج بھی ڈوگری اور ہندی تحریر کردہ اپنی اکثر کہانیوں کو اُردو کا روپ دیتے ہیں، اگر چہ بنیادی طور پر وہ اُردو کے بھی کہانی کار ہیں۔ اُردو افسانے کے منظرنامے سے غائب ہونے والی خواتین افسانہ نگاروں میں نذیر شہناز، شمی شاعر، روحی شال، رابعہ شاہین، زینت افروز زینت اور واجدہ تبسم کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ نصرت چودھری نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

اُن چند کہانی کاروں کا ذکر کرنا لازمی بنتا ہے جن کا بنیادی طور پر ریاست جموں وکشمیر سے کوئی تعلق نہیں لیکن جموں وکشمیر میں رہ کر انہوں نے اُردو افسانوی ادب کی نئی راہیں واکیں اور کشمیر کے پسِ منظر میں کہانیاں لکھیں۔ اُن میں کرشن چندر، کشمیر لال ذاکر، کنول نین پرواز اور آفاق احمد کے نام لینے سے ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کی قدر بڑھ جاتی ہے۔

مصرہ مریم، رفعت حجازی اور نیلوفر ناز نحوی کا نام لینا اس لئے ضروری ہے کہ انہوں نے اُردو افسانے کے تعلق سے کئی اہم کام انجام دیئے۔ مصرہ مریم نے بہت سی کشمیری کہانیوں کو اُردو کا روپ دیا، رفعت حجازی نے عربی کہانیوں کو اُردو زبان میں پیش کیا، نیلوفر نحوی نے چند فارسی کہانیوں کو اُردو اور چند اُردو کہانیوں کو فارسی میں ترجمہ کیا۔ خالد حسین بھی کبھی کبھار پنجابی زبان میں تحریر کردہ ادیب کارواں کا حصہ ہوتا ہے لیکن وہ اس کاروان میں فرد کی حیثیت سے بھی سفر کرتا ہے، اور تخیل کی چٹان پر کھڑا اس کاروان کو دیکھتا ہے، ریاست جموں وکشمیر کے ادیب بھی اس کاروان کا حصہ ہیں وہ جو کچھ دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں تحریر میں لاتے ہیں۔ حالات وواقعات کو افسانوی رنگ دیتے ہیں اور اس طرح سے آج بھی ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کا سفر

جاری ہے حامدی کاشمیری کے افسانوں میں انسان دوستی اور دردمندی کی فضا ملتی ہے، حسن ساہو کی کہانیوں میں مقامی رنگ ملتا ہے، منصور احمد منصور خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ظہور الدین نقاد بھی ہیں اور ادب کے مختلف گوشوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اُن کے تحریر کردہ افسانوں میں علامت کا صحیح ادارک ملتا ہے، شبنم قیوم کے افسانوں میں زندگی کے مختلف نشیب وفراز ملتے ہیں۔ غلام نبی شاہد اپنی ذہنی پختگی کے سہارے کہانیوں کی زلفیں سنوارتے ہیں۔ جان محمد آزاد کے افسانوں میں صحت مند تازگی ملتی ہے، دیپک کنول کے اکثر افسانوں میں اُن کی ذہنی بالیدگی کا احساس ہوتا ہے، راجہ نذر بونیاری کے افسانوں میں ریاست کے لوگوں کے مسائل اور مشکلات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ عبدالغنی شیخ کا تعلق لداخ سے ہے، اُن کے اکثر افسانوں میں لداخی طرز زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ وریندر پٹواری ایک حساس اور سنجیدہ کہانی کار ہیں، خواجہ فاروق رینزو اپنے افسانوں کے ذریعہ سماجی افراتفری کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زاہد مختار کی کہانیوں میں زندگی کے مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آنند لہر کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو چھوٹے کینواس پر سمیٹ کر پوری وضاحت اور کُھل کر پیش کرتے ہیں، اُن کے موضوعات نت نئے ہوتے ہیں۔ دیپک بدکی کی کہانیوں کا دائرہ وسیع ہے اُن کی کہانیوں میں تُرش اور شیریں تجربے ملتے ہیں۔ خالد حسین کے افسانوں میں شستہ اور صاف انداز ملتا ہے، مشتاق مہدی کی کہانیوں میں انسانی حقیقتوں کی خوبصورتی اور بدصورتی نظر آتی ہے۔ شام طالب اپنے افسانوں کے ذریعہ درد و کرب کی لہروں میں مٹھاس بھرنا چاہتے ہیں۔ شیخ بشیر احمد اپنی کہانیاں کشمیر کے موجودہ دور کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کے پس منظر لکھتے ہیں، رشید راہگیر کی کہانیوں کے کردار عام طور سے متوسط اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ طالب کشمیری افسانہ بُننے کے فن سے آشنا نظر آتے ہیں۔ پرویز مانوس اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کہانیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں، مجید ارجمند کے افسانے اُس کے قوت مشاہدہ کے حامی ہیں، مشتاق احمد وانی زندگی کے چھوٹے چھوٹے مگر اہم مسائل اپنے افسانوں میں اُبھارنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ کے ڈی مینی، ایوب شبنم اور عبدالسلام بہار کے نام بھی کبھی کبھار افسانوی دنیا میں نظر آتے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر کے افسانوی سفر میں موجودہ دور کی خواتین افسانہ نگاروں کو کسی طور نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، ریاست میں اُردو افسانے کو یہ خواتین مالا مال کر رہی ہیں اِن کے افسانے

زندگی کے متضاد پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں، ریاست جموں وکشمیر کی خواتین افسانہ نگاروں میں ترنم ریاض کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کے افسانوں کے موضوعات تروتازہ ہوتے ہیں۔ نسرین نقاش بنیادی طور پر شاعرہ ہیں لیکن انہوں نے اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں افسانے کو ہی ترجیح دی۔ ڈاکٹر نگہت نظر آج کی عورت کی زندگی کی بے شمار تلخیوں کو اپنے افسانوں میں سمیٹ لیتی ہیں۔ نعیمہ احمد مہجور اگر چہ اب افسانوی دنیا سے دور ہو چکی ہیں لیکن اُن کی تحریر کردہ افسانے آج بھی بہت سارے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں، نیلوفر نحوی خواتین افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہو چکی ہیں، زنفر کھوکھر کو مختصر کہانیاں لکھنے کا فن خوب آتا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کا تخلیقی سفر بڑی خوبصورتی اور سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے، منزل اگر چہ دور ہے لیکن نظروں سے اُوجھل نہیں، یہ سفر طے کرتے ہوئے موضوعات بدل چکے ہیں، اسلوب اور ٹریٹمنٹ میں ایک نیا انداز آ گیا ہے، عشق ومحبت کی داستانوں میں زندگی کی ٹھوس حقیقت غالب آ چکی ہیں، آج لکھی جانے والی کہانیوں میں آج کے انسان کی کہانی ملتی ہے، ریاست کے پُر آشوب دور کی عکاسی ملتی ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے ریاست جن حالات سے گزر رہی ہے اور عوام کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑھ رہا ہے سماج اور معاشرہ میں ہو رہی بداعمالیوں سے جو نتائج سامنے آ رہے ہیں، گولیوں اور بندوق کا جو چلن ہے، جنسی بے راہ روی کو جو بڑھاوا مل رہا ہے، گمشدہ افراد اور بے نام قبروں کی جو کہانی دوہرائی جا رہی ہے۔ ہماری سرحدوں کی لکیروں کے ساتھ جو زیادتی کی جا رہی ہے، بے گھر ہوئے لوگوں کا جو درد وکرب ملتا ہے گھر واپس لوٹنے کی چاہت ملتی ہے، یہاں کا افسانہ نگار ان سے بے خبر نہیں۔ یہ سب ریاست میں لکھے جانے والے افسانوں میں ملتی ہیں۔ ان افسانوں کے تخلیق کار سماجی، معاشی، عدم مساوات کے خلاف اپنی آواز بلند کر رہے ہیں وہ سیاسی بے راہ روی اور رجعت پسندانہ رویوں کے خلاف اپنی تحریروں کے ذریعہ ایک ان دیکھی لڑائی لڑ رہے ہیں، بھائی چارے، اخوت اور مذہبی رواداری کی عظمت کو آگے بڑھا رہے ہیں یہاں کے افسانہ نگار انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے افسانوں کے ذریعہ کوشش کر رہے ہیں کہ یہاں کے حالات وواقعات کی صحیح ترجمانی ہو وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نظر آ رہے ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں جو نام سامنے آ رہے ہیں اُن میں ناصر ضمیر، خالد کرار، شبنم طارق، اشرف آثاری، مشاق کینی، مقبول ساحل، جنید جاذب، محمد عمر

فرحت، ریاض توحیدی، ریاض ملک، اشوک پٹواری، زنفر کھوکھر، راجہ یوسف، نذیر جوہر اور شفیع ایاز کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ریاست بھر میں اُردو افسانے کا فن ایک نادر، دلچسپ اور منفرد حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ ہمارا افسانہ روبہ ترقی ہے، افسانہ پڑھنے والے اب حقیقت پسندانہ افسانوں میں دلچسپی لینے لگے ہیں، قارئین کی دلچسپی کی وجہ سے افسانہ اپنے مخصوص دائرے سے باہر نکل آیا ہے۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ غیر شعوری طور پر مجھ سے کچھ افسانہ نگاروں کے نام رہ گئے ہوں گے، اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کا ذکر کرنا رہ گیا ہوگا۔ اس وجہ سے مضمون میں تشنگی کا احساس بھی اُبھرا ہوگا، اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں، البتہ ایک ایسے شخص کا نام بھی ضرور لینا چاہوں گا جو گزشتہ قریب قریب پچاس برسوں سے اچھی بُری کہانیاں لکھ رہا ہے اور جس کے آٹھ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور اُن کا نام ہے نور شاہ..........!!

☆☆

''شیرازہ'' میں چھپنے والی نِگارشات

☆......ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔

☆......ہندوستانی تاریخ وتمدّن اور ثقافت وادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری تحقیقی مضامین قبول لئے جاتے ہیں۔

☆......ریاست کی تمدّنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات کو ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔

☆......فنِ تعمیر، آرٹ، مصوری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔

☆......منظومات، بشرطیکہ معیاری ہوں، قبول کی جاتی ہیں۔

☆

پروفیسر قدوس جاوید

کشمیر میں اُردو تنقید

آج کا دور تاریخیت (Historicity) کا نہیں۔ نو تاریخیت (Neo-Historicism) کا دور ہے۔ جس کی بنیادی صفت مرکز جوئیت (Centrifugal) نہیں مرکز گریزیت (Cen-Tripetal) ہے۔ چنانچہ اُردو زبان وادب کے حوالے سے جونئی تاریخیں سامنے آرہی ہیں ان میں جدید ترین لسانی و جمالیاتی اور سماجی وثقافتی تصورات ونظریات کے حوالے سے اُردو کی روایتی بڑے مراکز یا دبستانوں دہلی، لاہور اور لکھنؤ ٹھوس اور طے شدہ ادبی معائر اور مفروضات سے قطع نظر۔ اُردو شعر وادب کے نئے ذیلی اور ضمنی مراکز کی ادبی سرگرمیوں کے مزاج پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج کی تاریخ میں مابعد جدید سماجیات اور تہذیبیت (Post-Modern Socology And Culturology) کے زیر اثر بڑے اور مرکزی معاشروں اور تہذیبوں کے بجائے ذیلی اور علاقائی، معاشرتی تہوں اور طرفوں کو نمایاں کرنے کا رجحان عام ہوا ہے تاکہ عالمیت (Golbalisation) کے حوالے سے انتہائی ترقی یافتہ ''انسانی منطقوں'' کے ساتھ ترقی پذیر اور پسماندہ علاقوں تک کے انسانوں کی سوچ اور فکر، حقائق ومسائل اور ذوقِ جمال کا اندازہ لگایا جاسکے۔ چنانہ آج اُردو زبان وادب کے حوالے سے جونئی تاریخیں سامنے آرہی ہیں مثلاً تاریخِ ادب اُردو (جمیل جالبی) اُردو زبان وادب کی تاریخ (تبسم کاشمیری) مختصر تاریخ ادب اُردو (سلیم اختر) اور تاریخ ادب اُردو (پروفیسر وہاب اشرفی) وغیرہ، ان میں ایک طرف تو بڑی اور چھوٹی تمام اُردو بستیوں کے ادب اور ادیبوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہیں علاقائی اور ریاستی سطحوں پر شعر وادب کا تاریخی جائزہ لینا بھی اب معمول بن گیا ہے۔ مثلاً کشمیر میں اُردو، بہار

میں اُردو، بنگال میں اُردو وغیرہ اسی طرح اصناف کے حوالے سے بھی نئی تاریخیں لکھنے کا رجحان بھی اب کوئی نیا رجحان نہیں رہ گیا ہے۔ ایسے مطالعوں میں زبان واصناف کے آغاز وارتقاء، معائر اور جہات کے حوالے سے اور باتوں کے علاوہ مختلف، معاشرت اور ثقافت کے اندر اُردو کا تخلیقی اور تنقیدی ادب مختلف رنگوں میں سامنے آکر اُردو ادب کی شعریات میں تکثیر (Pluralism) اور بوقلمونیت پیدا کر رہا ہے جو اُردو زبان وادب اور اس کے گہوارے برصغیر کا اصل اور فطری مزاج ہے۔

چنانچہ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو تنقید کی صورتحال کے جائزے کا رشتہ بھی ادب کے ضمنی اور ذیلی مراکز کی ادبی سرگرمیوں کے مطالعے کی روایت سے ہی جوڑا تو جا سکتا ہے لیکن ابتداء میں ہی اس تلخ حقیقت کا اظہار یا اعتراف کر لینا چاہیے کہ ریاست جموں وکشمیر کی ادبی سرگرمیوں کا کوئی بھی سنجیدہ جائزہ ابھی تک نہیں لیا جا سکا ہے۔ عبدالقادر سروری نے ''کشمیر میں اُردو'' میں بعض بنیادی معلومات اور شاعروں اور ادیبوں کی فہرستیں ضرور فراہم کی ہیں۔ ان کی اساسی اہمیت بھی ہے لیکن آج اس تصنیف کو حوالے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے، کشمیر کی عصری ادبی سرگرمیوں کا اندازہ لگانے خصوصاً کشمیر میں اردو تنقید کی عصری صورتِ حال کے حوالے سے زیادہ مدد نہیں ملتی جہاں تک ریاست جموں وکشمیر میں عصری اُردو تنقید کا سوال ہے۔ اس ضمن میں عبدالاحد آزاد، محمد عمر نور الہیٰ، محمد الدین فوق، نند لال کول طالب، پروفیسر شکیل الرحمٰن، حامدی کاشمیری، عزیز احمد قریشی، پروفیسر محمد ابراہیم، پروفیسر حاجنی، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر برج پریمی، پروفیسر ظہور الدین، مشعل سلطان پوری اور شاہد بڈگامی وغیرہ کی تحقیقی وتنقیدی خدمات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ جموں وکشمیر میں اُردو تنقید کی صورتِ حال کا جائزہ اُس کے شناختی اور ثقافتی امتیازات کے ساتھ لینا بہتر ہوگا۔

دراصل کسی بھی زندہ اور ارتقاء پذیر معاشرے میں (جیسا کہ کشمیر ہے) کسی بھی زبان کی تنقید، شعروادب کا جائزہ اس ''نظامِ نقد'' (System of Criticism) کی رُو سے لیتی ہے جس نظامِ نقد میں اس معاشرے کے ماضی کے اکتسابات کی روح بھی کارفرما ہوتی ہے۔ حال (Present) کی عصری ترکیب بھی اور مستقبل کی تعمیری تخلیق بھی۔ دبستانِ کشمیر کی اُردو تنقید اسی امتیاز کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

لیکن چونکہ ہر نیا نظامِ نقد، کسی بھی معاشرہ اور ادب کے اندر اس معاشرہ اور ادب کی رُو سے

ہی وجود میں آتا ہے۔ اس لئے نظامِ نقد کا اپنے معاشرہ اور ادب کے سابقہ ثقافتی و تمدنی حقائق، لسانی وادبی نظریات، اجتہادات اور شعریات سے ایک جدلیاتی رشتہ ضرور ہوتا ہے، اور ہونا چاہیے لہٰذ ''کشمیر میں اُردو تنقید'' کے عنوان سے محض چند ایک تنقید نگاروں کے اسمائے گرامی اور ان کی تصنیفات کا ذکر کافی نہیں ہوگا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کشمیر کے تخلیقی ادب کی طرح کشمیر کے تنقیدی ادب میں بھی، کشمیر کی سماجیات، ثقافت اور اجتماعی لاشعوری سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں یا نہیں۔ اس نکتے کو کشمیر کے مشہور دانشور شمیم احمد شمیم کے درج ذیل اقتباس کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔

''مطلق العنان حکمرانوں کی چنگل سے آزاد ہونے کے بعد ہماری تہذیبی زندگی نے کروٹ لی تو ہمیں احساس ہوا کہ غلامی نے نہ صرف ہمارے جسم کو قید کر لیا تھا بلکہ ہمارے شعور کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور ''ہم ایک عظیم تہذیبی ورثے سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں''۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ کھوئی ہوئی میراث کو حاصل کرنے کے لئے ہم نے غیر معمولی جوش و خروش اور عزم کے ساتھ اپنی تہذیبی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ہمارے ادب میں ایک نئی توانائی پیدا ہوگئی جس نے ہمیں نئے حوصلے اور نئے افق دیئے...... لیکن یہ تہذیبی نشاۃ ثانیہ نامکمل رہتا اگر اس ملک کے گُم نام اور افتادہ فن کاروں کو بھی اپنے فن کی عظمت اور اہمیت کا احساس دِلا کر اس نئے کارواں میں شامل کیا جاتا...... ہمارے فن کی روایات انسان دوستی، عالم گیر اخوت اور ظلم و استبداد کے خلاف نفرت کی روایات ہیں۔ اس کا مزاج ایک باغیرت خوددار اور مستقل مزاج قوم کے حوصلوں کا آئینہ دار ہے ان قدروں کو ماضی کے ورثے سے کھنگال کر ہمیں نئی نسلوں کے سپرد کرنا ہوگا کہ وہ اپنی نئی زندگی کی تشکیل میں ان سے مدد لیں''۔

شمیم کے مذکورہ بالا اقتباس کے کلیدی الفاظ و تراکیب مثلاً انسان دوستی، عالم گیر اخوت' جبر و استبداد سے نفرت، غیرت مندی، خودداری اور مستقل مزاجی تہذیبی نشاۃ ثانیہ، ماضی کا ورثہ اور نئی زندگی کی تشکیل وغیرہ پر غور کریں تو صاف معلوم ہوگا کہ یہی وہ بنیادی اوصاف ہیں جن کی آمیزش و آویزش سے کشمیری اسلوب حیات اور طرز فکر و فن عبارت ہے یہی کشمیر کے ادب فن کا امتیاز و انفراد ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دبستان کشمیر کے تخلیقی ادب کی طرح تنقیدی ادب بھی اُردو کی دوسری بستیوں کے ادب سے قدم سے قدم ملا کر چل تو رہا ہے لیکن پھر بھی داخلی طور پر کشمیر کے اُردو ادب کا مزاج بیرون ریاست کے اُردو ادب سے مختلف بھی ہے۔ دراصل بیرون ریاست کی اُردو

تخلیق وتنقید میں نت نئے نظریات ورجحانات، اسالیب اور موضوعات کے حوالے سے تقلید وتتبع، فیشن پرستی اور گروہ بندی ''مرکز'' میں ہیں۔ انسان دوستی، ارضیت، فطرت پسندی، تہذیبی وابستگی اور مستقل مزاجی وغیرہ حاشیے پر ہیں جب کہ دبستان کشمیر کے تخلیقی وتنقیدی ادب میں انسانیت، ارضیت، قومی تشخص، اخلاقیات، خودداری اور احتجاج کے عناصر مرکز میں ہیں۔ تقلید اور فیشن پرستی حاشیے پر نظر آتے ہیں۔

برصغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح کشمیر کے ادیبوں نے بھی، مارکس اور اینجلز کی مارکسزم، سرمایہ دار اور محنت کش طبقہ کی کشمکش فرائڈ اور یونگ کے نظریہ خواب اور تحلیل نفسی کر کے گارڈ ڈیکاٹ اور مارسل پروست کی وجودیت، مشینی زندگی اور تنہائی سے لے کر سوسئیر کے نظریہ لسان، رولاں بارتھ لاکاں اور فوکو کے پس ساختیات Structualism اور ژاک دریدا کے رد تشکیل Deconstruction کے علاوہ، گلوبلائزیشن، کنزیومرزم وغیرہ کے اثرات کم یا زیادہ قبول تو کئے ہیں لیکن کشمیر کے ادیبوں نے عام طور پر کوری تقلید انتہا پسندی اور فیشن پرستی سے احتراز ہی کیا ہے۔ اسی لئے کشمیر کے تخلیقی ادب میں بالعموم فحاشی، اخلاقی بے راہ روی، جذباتیت، نعرہ بازی اور مادیت پرستی کی وہ صورت نہیں جس کی مثالیں ہمیں برصغیر ہندوپاک کے بعض کے دیگر مراکز کے اُردو تخلیقی ادب میں ملتی ہیں۔ توازن وتناسب کے ساتھ تازہ ہواؤں کا استقبال اور اظہار کشمیر کی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ کشمیر کے معاصر اُردو ادب کا بھی خاصہ رہا ہے۔ کیونکہ اس کی جڑیں بھی للہ دید، شیخ العالمؒ اور شاہ ہمدانؒ سے لے کر علامہ اقبالؔ، مہجور، عبدالاحد آزاد، غلام رسول نازکی اور رسا جاودانی تک کی روحانی، انسان دوست اور تعمیری فکریات اور متوازن اور معنی خیز فنی و جمالیاتی روایات میں پیوست رہی ہیں۔

جہاں تک اُردو تنقید کا سوال ہے۔ کشمیر میں اُردو تنقید کے بنیاد گزاروں، عبدالاحد آزاد، صاحبزادہ محمد عمر اور نور الہٰی اور محمد الدین فوق سے لے کر جگن ناتھ ولی، ہندکول طالب تک کے یہاں آگہی وبصیرت کی جدت وندرت اور تہہ داری کے باوجود ثقافتی شعریات جگہ جگہ ملتی ہے جسے ہم کشمیری شعریات کا نام دیں یا دبستان کشمیر کا انفراد وامتیاز۔ کشمیر میں اُردو تنقید کا آغاز وارتقا اِسی مخصوص ومنفرد شعریات کے زیر سایہ ہوتا ہے۔

عبدالاحد آزاد جنھیں کشمیر کا حالی کہتے مقدمہ شعروشاعری کی تصنیف (۱۸۹۳ء) کے کم

وبیش پچاس سال بعد ''کشمیر زبان اور شاعری'' (تصنیف ۱۹۴۸ء اشاعت ۱۹۵۹ء) میں شعر وادب کی ارضیت پر زور دیتے ہوئے کہا ہے۔

''حقیقی شاعر وہ ہے جس کی شاعری اس کے طبعی اور سماجی ماحول کی آئینہ دار ہو یعنی جس کے کلام سے معلوم ہو سکے کہ شاعر کے طبعی اور سوسائٹی کے حالات کی کیفیت کیا ہے۔ اس کے ملک کی سطح اور آب وہوا کیسی ہے۔ تہذیب وتمدن کا کیا حال ہے۔ نظام حکومت کس نوع کی ہے وغیرہ وغیرہ۔''

''جس طرح گل زمین کا شعر، ریگ وسراب، صحرانخلستان اور شتر ومحمل پر مضمون باندھنے کا مستحق نہیں۔ اسی طرح ریگستان کا شاعر گل وبلبل اور باغ وبہار پر مضامین وخیالات پیدا کرنے کا حقدار نہیں ہو سکتا۔''

صاف ظاہر ہے کہ عبدالاحد آزاد یہاں شعر وادب میں کشمیر کی سماجیات اور ثقافت کے حوالے سے ہی ارضیت اور حقیقت پسندی پر زور دے رہے ہیں۔ آزاد ایک پختہ کار نقاد کی طرح شاعری کے مقام ومرتبہ، لوازمات اور شرائط کا بھی گہرا شعور رکھتے تھے۔ اسی لئے غالب پر ناقدانہ رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''شعر کے حسن وخوبی کا صحیح معیار، محض زبان کی صفائی اور سلاست نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مرزا غالب شعراء اُردو کا سرتاج نہ کہلاتے ان کا کلام الہام نہ کہلاتا۔ مرزا کو یہ رُتبہ معنی آفرین، مضمون بندی اور تخیلات کی جدت اور بلندی نے عطا کیا۔ ان کے اُردو کلام کی فارسیت ان کے شاعرانہ آب وتاب کے سامنے اس طرح غائب ہو جاتی ہے جس طرح سورج کے سامنے تارے چھپ جاتے ہیں۔''

کشمیر کے ابتدائی اُردو ناقدین میں نند لال کول طالب کاشمیری کو عبدالاحد آزاد سے کم تر درجے کا نقاد قرار دینا مشکل ہے۔ بلکہ غالب شناسی کے حوالے سے طالب کاشمیری، نے کشمیر کے ہی نہیں، برصغیر کے بھی کئی غالب شناسوں، حالی، قاضی عبدالودود، عرشی رامپوری، مالک رام، مسعود حسین خاں وغیرہ سے قدرے الگ راہ نکالی ہے۔ طالب کی کتاب ''جائزہ کلام غالب'' کو بعض جہتوں سے شمس الرحمٰن فاروقی کی ''تفہیم غالب'' پر بھی فوقیت دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ فاروقی نے شعر غالب کی قرات اور تعبیر وتشریح کے معاملے میں اکثر وبیشتر قاری کو شعر، شعریت اور معنی ومفہوم کی مختلف علمی اور فلسفیانہ مباحث میں اُلجھا کر شعر غالب کی گہرائیوں اور تہہ داریوں کی تفہیم میں

رُکاوٹیں ہی پیدا کی ہیں جس کی نشاندہی مشکور حسین یاد نے اپنی کتاب ''غالب بوطیقا'' میں دلائل کے ساتھ کی ہے۔ طالب کاشمیری کے یہاں عبدالرحمٰن بجنوری کی طرح تنقید کے نام پر منطقی جذباتیت اور انتہاپسندانہ عقیدت مندی بھی نہیں اور نہ طالب نے سخن فہمی کے حوالے سے کسی طرح کی طرف داری سے کام لیا ہے۔ لیکن جیسا کہ شروع میں ہی کہا گیا کشمیر کی کلاسیکی اُردو تنقید کے مرکز میں مانگے ہوئے نظریات اور لادے ہوئے تعصبات نہیں بلکہ ادب فہمی کے وہ معائر بھی ہیں جو عربی کے قدامہ بن جعفر، جاحظ، قتنیبہ اور جرجانی کے علاوہ فارسی کے وطواط (امیر عنصر المعالی) نظامی عروضی سمرقندی سے لے کر اُردو کے حالی، شبلی اور عبدالرحمٰن دہلوی تک کے یہاں بیان کئے گئے ہیں۔ طے شدہ تصور، رائے اور طریقہ کار کے بجائے طالب کاشمیری براہ راست متن یا شعر کی روح میں اُتر کر شعر کی فنی و جمالیاتی انفرادو امتیازات کی نشاندہی کرتے ہیں ہر شخص جانتا ہے کہ غالب کہ غالب کا کوئی بھی شعر وحدانی، ٹھوس اور مستقل معنی و مفہوم تک محدود نہیں رہتا بلکہ غالب کا ہر شعر، ہر مزاج، ذوق، ذہن اور معیار کے قاری کے لئے تفہیم و تعبیر شعر کا ایک کڑا امتحان ثابت ہوتا ہے۔ طالب کاشمیری نے نہایت عالمانہ لیکن سادہ اور شستہ انداز میں شعر غالب کے اس کمال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مرزا ایک جدت طراز فن کار ہیں وہ شاہراہ عام سے ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالتے ہیں اور بہر صورت اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں ادائے مطلب کے لئے لفظ و معنی کا ایک نیا رشتہ دکھاتے ہیں۔ تازی تشبیہوں اور نادر استعاروں سے نازک خیالی اور معنی آفرین کے دریا بہا دیتے ہیں۔ ترکیب سازی، ایجاز و اختصار اور تمثیل و کنایہ سے کام لے کر عبارت قلیل میں معنی کثیر ادا کرتے ہیں۔ جدت ادا سے مفہوم شعر میں رنگینی اور وسعت پیدا کرتے ہیں۔ متقدمین اور متاخرین اور بعض اوقات معاصرین کے خیالات و مضامین میں لفظی و معنوی تصرفات سے کہیں پرانے خیال میں اضافہ کرتے ہیں۔ کہیں خیال کے ایک پہلو کو بدل کر اس کا دوسرا پہلو سامنے لاتے ہیں۔ کہیں دو مختلف خیالوں سے ایک نئے خیال کو جنم دیتے ہیں۔ اسی طرح پامال اور فرسودہ مضامین کو طرفگی اور ندرت کا جامہ پہناتے ہیں...... ان کے تخیل، قوتِ ادارک حسن و وجدان، اُمید و نا اُمیدی کی کشمکش درد کی کسک، گذار کی کیفیت اور ذہنی تصورات نے ان کی شاعری کو وہ رنگ بخشا جس کا پرتو اُردو کے دوسرے شعراء کے ہاں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا''۔

نندلال کول طالب نے غالب کے شاعرانہ انفراد اور امتیاز کو جس طرح پختہ تنقیدی شعور اور تجزیاتی اسلوب میں نمایاں کیا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کا شمار بجا طور پر اُردو کے ممتاز غالب شناسوں میں ہوتا ہے۔

نندلال کول طالب نے غالب کی شعرانہ انفراد اور امتیاز کو جس طرح پختہ تنقیدی شعور اور تجزیاتی اسلوب میں نمایاں کیا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کا شمار بجا طور پر اُردو کے ممتاز غالب شناسوں میں ہوتا ہے۔

طالب کاشمیری سے ہی کشمیر میں اُردو تنقید کے معیار میں بلندی اور رفتار میں تیزی آتی ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ طالب غنی کاشمیری اور اقبال کے ذکر سے پرہیز کرتے ہیں۔ جب کہ اقبال ان کے ہم عصر تھے اور اقبال نے غالب کے تئیں جس عقیدت کا اظہار کیا ہے اس سے دنیا واقف ہے۔ مجہور، عبدالاحد آزاد اور اقبال، کم وبیش طالب کے معاصرین میں سے تھے، اور ان تینوں نے کشمیر سے اپنی روحانی وابستگی کا برملا اظہار کیا ہے لیکن غالب شناسی کی بہترین مثالیں پیش کرتے ہوئے طالب نے غنی کاشمیری کو مجہور کو کشمیر کے حوالے سے ان کے جذبات وخیالات کو نظر انداز کیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر برج پریمی کے ساتھ نندلال کول طالب نے لل دید کے واکھوں سے متعلق اپنی تشریحات میں اور رہبر تخلص کے ساتھ اپنی اُردو نظموں اور غزلوں میں مخصوص ومنفرد کشمیری شعریات کا لحاظ ضروری رکھا ہے۔

کشمیر میں اُردو تنقید کے حوالے سے حبیب کیفوی اور محمد الدین فوق، محمد عمر، نور الٰہی، مولوی ابراہیم، موتی لال ساقی اور پروفیسر حاجنی سے لے کر نشاط انصاری اور مشعل سلطانپوری تک کے نام لئے جاسکتے ہیں یہ سبھی اصلاً تحقیق کے مردِ میدان ہیں۔ محمد یوسف ٹینگ اور حامدی کاشمیری پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ جو شیرازہ کے محمد یوسف ٹینگ نمبر اور حامدی کاشمیری نمبر میں محفوظ ہیں۔ (ٹینگ نمبر اور حامدی کی تحقیق وتنقید نگاری سے متعلق میرے تفصیلی مضامین ان نمبروں میں شامل ہیں۔) لیکن یہ بات طے ہے کہ ٹینگ اور حامدی عصری اُردو تحقیق وتنقید کا وقار ہیں۔

حامدی کاشمیری ایک ہمہ جہت نقاد ہیں۔ جدید اُردو نظم پر یورپی اثرات، اقبال اور غالب، کارگہہ شیشہ گری اور حرف راز، سے لے کر اُردو نظم کی دریافت، متن اور تجربہ، جدید شعری منظر نامہ، تفہیم وتنقید اور ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ حامدی کاشمیری کی تنقید ہر حلقہ

میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔اس کے اسباب کئی ہیں۔اوّل یہ کہ وہ جدید ترین لسانی ادبی اور ثقافتی تھیوریز اور تصورات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اُردو شعروادب کی تفہیم و تعبیر کی کوشش کرتے ہیں اور اس ضمن میں اُردو شعروادب کے سابقہ روشن نقطے بھی ان کے لاشعور میں کرنیں بکھیرتے رہتے ہیں۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے تنقیدی افکار ی خیالات اُردو شعروادب کی روایات اور اجتہادات سے رشتہ بھی قائم رکھے ہیں اوران میں شعروادب کے نئے امکانات کی پردہ کشائی بھی ہوتی ہے۔عہد بہ عہد اُردو شعروادب کی شعریات پران کی گہری نظر ہے لیکن ان کا ذہن اوررویہ بہر حال تقلیدی ہرگزنہیں اسی لئے شعر کی ماہئیت اور حقیقت کے ضمن میں حامدی کاشمیری، پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور وزیر آغا سے قدرے الگ تصورات رکھتے ہیں۔اس کا اندازہ ''کارگہِ شیشہ گری''،''نئی حسیت اور عصری اُردو شاعری اور اکتشافی تنقید کی شعریات وغیرہ میں موضوع، معنی، تخلیلی تجربہ وغیرہ سے متعلق ان کے خیالات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حامدی کے یہاں شعر کے آزادومختاروجود، متن سے مصنف کے غیاب، متن کی قرأت کے تفاعل میں قاری کی شرکت کے امکانات، شعر میں الفاظ کا غیرروایتی لسانی برتاؤ، تخلیق کی تفہیم میں زبان کا کرداراور تخلیق میں موضوع کی جگہ صنفی امتیازات اور معنی برعکس تجربہ کی موجودگی پراصرار ملتا ہے۔دراصل کسی بھی بڑے اور مستند ناقد کی پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ تخلیق، تحقیق اور تنقید کے بارے میں وہ خود ایک صائب اور معتبر رائے رکھتا ہے۔چنانچہ اس ضمن میں بھی حامدی دوسرے ناقدین سے مختلف ہیں۔مثلاً تخلیق اور تنقید کے ربط و تعلق کے حوالے سے حامدی کا خیال ہے کہ:

''تخلیق......اپنی ہیت اور عناصر ترکیبی یعنی لسانی نظام، علامت کاہری اور ابہام کی بنا پر دشواری پسندی کے رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔اس لئے قارئین کے لئے لامحالہ تفہیم و تحسین کے مسائل پیدا کرتی ہے۔......ان مسائل سے نمٹنے اور تخلیق کے داخلی پیچیدہ تجربے تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تنقید کی ایک توسیعی ضابطہ بند اور خود کفیل شعبۂ ادب یا ڈسپلن کے طور پر ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے''۔

اسی طرح حامدی بھی یہ مانتے ہیں کہ معیاری تنقید کے لئے تخلیق کے کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔''اکتشافی تنقید کی شعریات''میں حامدی واضح لفظوں میں کہتے ہیں:

''چونکہ نقاد کا واسطہ متن سے رہتا ہے۔اس لئے متن کی ساخت، اس

کے الحاقی عناصر، مصنف سے اس کی زمانی بعد جیسے مسائل سے اس کا متصادم ہونا قابلِ فہم ہے۔ بظاہر یہ وہ مسائل ہیں جو تحقیق کے زمرے میں آتے ہیں تاہم تحقیق، نقاد کے لئے شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ اسے اپنے نتائج فکر کی درستگی کو یقینی بنانے کے لئے محقق کا رول بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ متن کے حوالے سے بعض ایسے الفاظ، تلمیحات اور اسطور کی تاریخی، مذہبی یا ثقافتی معنویت اثر انگیزی اور گہرائی کی تلاش و تعین ضروری ہو جاتی ہے جو سیاقی اہمیت کے حامل ہوں ظاہر ہے تحقیق بھی تنقیدی عمل کے دائرہ کار میں آتی ہے...... پس نقاد کے لئے تحقیق کے آداب سے بھی واقف ہونا ضروری ہے''۔

حامدی کاشمیری جہاں تنقید کے منصب میں ایک واضح رائے رکھتے ہیں وہیں نقاد کے فرضِ منصبی سے متعلق بھی دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں۔

''ادبی نقاد کا کام یہ ہے کہ وہ تکمیل یافتہ تخلیق کے لسانی نظام کے غائر تجزیاتی مطالعے سے بنیادی تخیلی تجربے تک رسائی حاصل کرے جو تخلیق کی اصل ہے۔''

''میری کوشش یہ رہی ہے کہ...... متن پر اپنی توجہ مرکوز کر کے اس سے اُگنے والے منفرد اور مخصوص شعری عمل کا اکتشافی تجزیہ کر کے ان تخلیلی تجربات کی نشاندہی کروں جو نامعلوم جہات کی جانب سفر کرتے ہیں۔''

تنقید سے متعلق اپنے اس نظریہ کی بنا پر حامدی کاشمیری ان تمام طریقہ ہائے نقد کو رد کرتے ہیں جو ''فن کی ماہیئت اس کی خود مختاریت، اس کے مخصوص تخلیقی محرکات اور اس کے ہیئتی اور علامتی امکانات سے صرف نظر کر کے اس کو (یعنی فن کو) موضوع اور ہیئت کے دو واضح خانوں میں تقسیم کر کے اس کی صحافتی تشریح پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس لئے حامدی تمام سابقہ تنقیدی نظریات کو نارسائی، سطحیت اور محدودیت کا شکار قرار دیتے ہوئے تازہ ترین لسانی اور ادبی تھیوریز کے حوالے سے تنقید کا ایک نیا تصور پیش کرتے ہیں جسے انہوں نے ''اکتشافی تنقید'' کا نام دیا ہے۔ لیکن یہ اکتشافی تنقید کیا ہے؟ اور اس کی شعریات کے اسرار و رموز کیا ہیں۔ ان ساری باتوں کی وضاحت میں نے اپنے مضمون ''حامدی کاشمیری کی تنقیدی تھیوری'' میں تفصیل کے ساتھ کی ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو تنقید کے منظرنامے کا ایک منفرد نام محمد یوسف ٹینگ بھی ہے۔

جنہیں میں نے بارہا اُردو تنقید و تحقیق کی ''تیسری آنکھ'' لکھا ہے۔ غیر معمولی تجزیاتی شعور، بے مثل تحقیقی سوجھ بوجھ اور ریاضت کے ساتھ ساتھ نفیس اور دل نشین اسلوب کی بنا پر یوسف ٹینگ اُردو تنقید و تحقیق کے میدان میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ یوسف ٹینگ نے یہ مقام اپنے جن متنوع انفرادی امتیاز کی بنا پر حاصل کیا ہے۔ ان کی تہہ علمی و آگہی کے حصول کے تئیں ان کا وہ جنون ہے جو کسی بھی دانشور، محقق اور ناقد کو غیر معمولی بنانے کے لئے لازم ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یوسف ٹینگ، علم و آگہی کو اظہار میں لانے سے زیادہ چھپا چھپا کر رکھنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ اُردو میں اب تک ان کی صرف تین تحقیقی و تنقیدی تصنیفات سامنے آسکی ہیں۔ (۱) شناخت، (۲) جستہ جستہ (۳) کشمیر قلم۔

محمد یوسف ٹینگ برصغیر کے ایسے عجوبہ روزگار دانشور ہیں جن کا وجود جانے کتنی معلوم اور نامعلوم تہیں رکھتا ہے۔ اب تک یوسف ٹینگ کے جن امتیازات کی نشاندہی کی جاسکی ہے۔ ان کے مطابق وہ ایک معتبر مورخ، ماہر کشمیریات، تہذیب و ثقافت کے شناور، مخطوطات کے نباض، مصوری اور نقاشی کے فن آشنا نامور محقق اور منفرد نقاد کی حیثیت سے اپنی اہمیت منوا چکے ہیں۔ یوسف ٹینگ کے تنقیدی مضامین کا بغور مطالعہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ یوسف ٹینگ کے یہاں تنقید کے وہ تازہ رویے بھی سرگوشیاں کرتے نظر آتے ہیں جو آج اپنی ارتقائی صورتوں میں مابعد جدید تنقید کے ذیل میں آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے مقالہ ''رسا جاودانی'' میں یوسف ٹینگ نے رسا کے متن کا ''بین المتونی'' Inter Textual جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور اس ضمن میں رسالے کے متن کو شیخ سعدی، حافظ شیرازی، امیر خسرو، غالب، اقبال اور مہجور کے متون کے حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے کی جو کوششیں کی ہیں ان سے یہ ایک بھی سامنے آتے ہے کہ تنقید۔ ایک آزاد فکری اور سیال ''تعبیری کیفیت'' سے بھی عبارت ہے جو بنیادی متن اور اس سے مشابہہ یا متضاد متن کے تحرک و تفاعل کے سبب معنی و مفہوم کی تشکیل (Construction) یا ردِ تشکیل (Deconstruction) کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ گوپی چند نارنگ، حامدی کاشمیری، شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر وہاب اشرفی وغیرہ کی طرح محمد یوسف ٹینگ بھی شعر میں الفاظ کے برتاؤ کی نوعیت کو شعر کی اہمیت و معنویت کی بنیاد تصور کرتے ہیں۔ البتہ محمد یوسف ٹینگ کے مضامین میں اس کا اظہار زیادہ تر بالواسطہ طور پر ہوا ہے۔ رسا جاودانی سے

متعلق ان کے مقالے میں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

خالص تحقیقی اور کلیتاً تنقیدی مضامین کے بعد محمد یوسف ٹینگ کے وہ مضامین آتے ہیں جنہیں ہم تحقیقی بھی کہہ سکتے ہیں اور تنقیدی بھی۔ اس طرح کی تحریریں محمد حسن، شکیل الرحمٰن، برج پریمی، غلام نبی خیال، خالد بشیر، جمیل جالبی کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ جمیل جالبی نے میر تقی میر کے نکات الشعراء کے حوالے سے اس طرح کے تنقیدی اور تحقیقی کاموں کے لئے ''تحقید'' کی اصطلاح وضع کی ہے اور تنقیدی تحریروں سے الگ یہ اصطلاح ''تحقید'' ایک خاص طرح کی تحریروں کے مزاج کو ظاہر کرنے کے لئے انتہائی موزوں بھی ہے اور میری رائے میں محمد یوسف ٹینگ کی اکثر و بیشتر تحریریں ''تحقیدی'' نوعیت کی ہی ہیں لیکن مرحلہ تحقیق کا ہو یا تنقید کا کشمیریت ہر موڑ پر ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ یوسف ٹینگ کے ایک مقالے ''سر سید احمد خان'' کے یہ اقتباس دیکھئے۔

''سر سید احمد خان ایک رزمیہ کردار کے قالب میں ڈھل کر آئے تھے اور وہ ساری عمر ایک ایپک (Epic) کے ہیرو بنے رہے۔ سر سید اپنے ظاہر اور پیکر کی شوکت سے کسی جنگ نامے کے صفحات سے گونجتے ہوئے دلی کی اس سرزمین میں مصروف عمل تھے جہاں مسلمانوں کے خون سے سینچی گئی اور ان کی ہڈیوں سے انگریز سلطنت کی فصیل تیار کی گئی تھی، لیکن ان کا باطن بھی کسی اُبلتے ہوئے آتش فشاں سے کیا کم تھا۔ وہ ایک زبردست انشا پرواز، ایک تقدیر ساز مفکر علامہ دہر، سماجی مصلح، ماہر تعلیم، صحافتی اور انقلابی...... ہاں انقلابی تھے۔''

''ہم کشمیریوں کے لئے سر سید کی اہمیت ظاہری بھی ہے اور معنوی بھی۔ ماں کی طرف سے ان کے جد امجد عزیز الدین ایک کشمیری تاجر تھے۔ انہوں نے شاہ جہاں آباد کو اپنا مستقر اور مرکز بنایا۔ وہ کشمیری شال کی تجارت کرتے تھے۔ ان کے پوتے خواجہ فرید الدین اپنے تمول کی بنا پر دلی کے رئیس بن گئے تھے لیکن وہ کشمیریوں کی علم افزائی اور دانش دوستی کے بھی نمونے بن گئے وہ ایک عالم ایک مدبر اور منتظم بن کر اُبھرے اور ایک بار انہیں بہادر شاہ ظفر نے اپنا وزیر اعظم بھی بنایا اسی خواجہ کی لاڈلی بیٹی عزیز النسا تھی...... ان کی

شادی ہرات سے آئے ہوئے سید متقی سے ہوئی اور انہیں کی اولاد سر سید احمد تھے۔"

بہر حال تحقیق ہو، تنقید ہو یا تاریخ محمد یوسف ٹینگ کا ایک قابل توجہ امتیاز ان کا سلوبِ بیان بھی ہے۔ ہند و پاک کے اکثر و بیشتر دانشوروں نے محمد یوسف ٹینگ کی نثر کی کھلے دل سے مدح سرائی کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ محمد یوسف ٹینگ کی نثر کی دنیا سے گزریں تو کہیں تہذیبِ گزشتہ کے سکون بخش سائے نظر آئیں گے، اور کہیں امتِ مسلمہ کے ماضی کے سطوت و تمکنت کے پُر وقار نشانات کبھی عرب و عجم کے علوم و فنون کی باریکیاں بصارت و بصیرت میں اضافے کا سبب بنیں گی تو کہیں ایسا محسوس ہوگا جیسے اساتذہ کے اشعار سرگوشیاں کرتے ہوئے ساتھ ساتھ سفر کر رہے ہوں، آل احمد سرور، شمیم احمد شمیم، خلیل الرحمٰن اعظمی، شکیل الرحمٰن اور کمال احمد صدیقی وغیرہ نے یوسف ٹینگ کے اس "طرزِ خاص" کے تئیں پسندیدگی کا اظہار یوں ہی نہیں کیا ہے ایک آدھ اقتباس آپ بھی دیکھ لیں۔

ا...... "تموچن صحرائے گوبی سے ایک آندھی کی طرح اُٹھا تھا اور چنگیز خان بن کر بڑے بڑے شہنشاہوں اور قہرمانوں کے تخت اُلٹ رہا تھا۔ چین سے بحیرہ قلزم تک انسان کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کئے جا رہے تھے۔"

۲...... کشمیر پچھلے ہزارے کے شروع میں مصوری کا ایک شاندار اسلوب اور نشرگاہ تھا۔ زمینی زلزلوں کے مرکز کی طرح تہذیبی جوار بھاٹے کے گرد و نواح میں ہونے کے سبب اس کی یہ متاع بھی آفات ارضی کی زد میں آگئی جو کچھ بچ سکتا تھا اس کو کشمیر کی مرغوب آب و ہوا اور برف و باراں نے ٹھکانے لگا دیا"۔

یوسف ٹینگ کی خالص تنقیدی تحریروں میں "منٹو کی افسانہ نگاری"، "رسا جاودانی"، "غنی کاشمیری"، "حسرت موہانی عاشق اور مجاہد"، "کشمیری شاعری میں جدید رجحانات"، "چلمن سے چلمن" اور ابوالکلام آزاد "شخصیت کے پیچھے شخص" ایسے مضامین ہیں جنہیں تنقید کا اعتبار اور معیار کہا جا سکتا ہے۔ خاص طور ر یوسف ٹینگ کا مضمون "منٹو کی افسانہ نگاری" ان کے ایک منفرد نقاد ہونے کی ضمانت ہے۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں۔ منٹو اُردو ہی نہیں پورے برصغیر کے "کتھا ساہتہ" کے معیار و وقار کی علامت ہے۔ منٹو پر آج تک جتنی زبانوں میں اور جتنے بھی یادگاری مضامین لکھے

گئے ہیں۔ یوسف ٹینگ کا مضمون ''منٹو کی افسانہ نگاری'' ان میں سے ایک ہے۔ یوسف ٹینگ نے اس مضمون میں منٹو کے فن کا جائزہ نئے زاویئے سے لیا ہے۔

یوسف ٹینگ اپنے مضمون کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

''افلاطون نے اپنی اکادمی کی ڈیوڑھی پر یہ کتبہ آویزاں کر رکھا تھا''۔

''اقلیدس سے ناواقفیت رکھنے والا کوئی شخص اندر نہ آنے پائے''۔

اور پھر منٹو کے فن کو مختلف زاویوں سے اپنے دیدہ بینا میں سمیٹ کر یوسف ٹینگ کہتے ہیں۔

''اقلیدس ریاضیاتی تنظیم و تقسیم کا ایک نظام ہی نہیں ہے۔ بلکہ فطرت کی تفہیم و تکلیم کا ایک زاویہ نظر بھی ہے...... یہ آرٹ کے متن اور اس کی ہیئت کی تشخیص کی بھی ایک پہچان بن سکتا ہے اُردو میں سعادت حسن منٹو کا ادب اس نقطہ نظر کی بہترین تفسیروں میں سب سے بڑی پہچان اس کا یہی اقلیدسی انداز ہے''

اور صرف اتنا ہی نہیں۔ یوسف ٹینگ نے، ترقی پسندی جدیدیت، انسانی اقدار، جنس کی نفسیاتی عریانی، فحاشی، مذہب و اخلاق، الفاظ کی قوت، ردِعمل کا لاشعوری اظہار جسم مرد اور عورت وغیرہ کے حوالے سے منٹو کے فن کا بڑی گہرائی سے تجزیہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''منٹو دراصل افسانوی ادب کا شنکر تھا جس نے زندگی کا سمندر کھنگال کر سارا زہر اپنے وجود میں سمو لیا یہی وہ زہر تھا جسے منٹو نے اپنے افسانوں میں قطرہ قطرہ اس طرح پیش کیا کہ اُردو افسانہ کے لئے تریاق بن گیا''۔

حامدی کاشمیری اور محمد یوسف ٹینگ کے بعد کی نسل پروفیسر ظہور الدین اور ڈاکٹر برج پریمی نے جموں و کشمیر نے جموں و کشمیر میں اُردو تنقید کا معیار اور وقار بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

پروفیسر ظہور الدین کی ادبی سرگرمیوں کے خاص شعبے تنقید اور تحقیق ہی ہیں۔ حالانکہ انہوں نے ڈرامے بھی لکھے۔ افسانے بھی اور شاعرانہ اظہار کے معاملے میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے۔ اب تک پروفیسر ظہور الدین کی متعدد تنقیدی ناواقفیت منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں ''تفکرات''، ''محروم کی شاعری''، ''بیسویں صدی کے اُردو ادب میں انگریزی کے ادبی رجحانات'' حقیقت نگاری اور اُردو ڈرامہ''، ''جدید اُردو ڈرامہ''، ''تعلیل و تاویل''، ''ترجمہ نگاری کا فن''، ''کہانی کا ارتقاء'' اور جدید ادبی و تنقیدی نظریات وغیرہ اس کے علاوہ پروفیسر ظہور الدین نے مختلف سمیناروں اور رسائل و جرائد کے لئے جو متفرق مضامین لکھے ہیں وہ ان پر مستزاد ہے۔ پروفیسر ظہور الدین کی

تنقیدی تحریروں کا جائزہ لیں تو پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ شعروادب کی ماہیئت، غرض وغایت اور قدیم وجدید ادبی تصورات ونظریات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور چونکہ عمدہ تنقید کے لئے تنقید نگار کے اندر منفرد نظر اور فکر اور اظہار وترسیل کی غیر معمولی صلاحیت کا ہونا بھی ضروری ہے اور پروفیسر ظہورالدین کی تنقیدی تحریروں میں یہ ساری خوبیاں اپنی ترقی یافتہ صورتوں میں ملتی ہیں۔ اس کا اندازہ آپ ان تحریروں کے درج ذیل اقتباسات سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔

ا......اس میں کوئی شک نہیں کہ آرٹ، زندگی اور کائنات کو مکمل کرنے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ اس مقصد کو سامنے رکھنے کے بعد ادیب کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کے فنی لوازم کو نظر انداز کر دے اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ مقصد کو اوّل درجہ حاصل ہے اور فنی لوازم کو ثانوی۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہر فن پارہ کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے آرٹ اور پھر مقصد ہونا چاہیے۔''

۲......اخلاقی قدروں کو نظر انداز کر کے کوئی ادب حسین زندگی کا خواب نہیں دیکھ سکتا۔ جس زندگی کا مطلب صرف یہاں مادی زندگی نہیں ایک ایسی خوشحال زندگی ہے جس کی بنیاد مادی فراغت اور اخلاقی جرأت پر مبنی ہو۔ اخلاقی کرنیں صرف فن پارے سے ہی نہیں بلکہ اس فن کار کی زندگی سے بھی پھوٹنی چاہیے۔

۳......ترقی پسندی سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں......ترقی پسند تحریک نے جس دور میں جنم لیا وہ ہندوستان میں بھوک اور افلاس کا دور تھا اور اگر کوئی شاعر اس سے متاثر ہو کر اپنے پژمردہ بھائیوں کے حوصلے بڑھانا چاہتا ہے تو کسی کو کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔

۴......غزل انسان کے نفسیاتی وجود سے مکمل مطابقت رکھتی ہے۔ اس کا آغاز بادی النظر میں چاہے کسی بھی وجہ سے کیوں نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان کا نفسیاتی عمل کبھی مسلسل نہیں ہوتا وہ ہمیشہ اشاروں میں ظاہر ہوتا ہے اور اشارے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں مبہم اور مختصر ہوتے ہوئے بھی مکمل ہوتا ہے''۔

۵......ناول چونکہ زندگی کی حقیقتوں کو فرضی واقعات وکرداروں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے اس کے اسلوب میں آپ ہی آپ دوہری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ ہمیں یا قارئین کو مفہوم کی دو سطحوں سے آشنا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نچلی سطح پر پلاٹ کے

واقعات پر کرداروں کے اعمال سطحی مفہوم کی ترسیل کا موجب بنتے ہیں۔ جب کہ بالائی سطح پر پہنچ کر وہ قارئین کو زندگی کی نئی بصیرتوں سے ہمکنار کر کے انکشاف حیات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایک اچھے ناول کا بنیادی مقصد اسی انکشاف کی ترسیل ہوتا ہے۔"

ان اقتباسات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پروفیسر ظہور الدین، ادب، ادیب، ادبی اصناف اور ادبی نظریات و تصورات سے متعلق اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار سنجیدہ اور ترسیلی اسلوب میں اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی تنقید ادبی ہی رہتی ہے۔ فلسفہ اور علمیت کا اظہار نہیں بنتی۔ جیسی کہ آج اکثر و بیشتر ناقدین کے یہاں دیکھنے میں آتی ہے۔ دوسری بات ظہور الدین ضرورت کے مطابق زبان وادب سے متعلق، قدیم وجدید تصورات ونظریات، اصول اور معلومات سے استفادہ تو کرتے ہیں۔ لیکن ادبی زبان، ادب اور ثقافت کے مطابق اپنے تنقیدی شعور کا حصہ بنا لینے کے بعد جو باتیں ہماری اپنی تہذیب واخلاقیات کے منافی ہوتی ہیں وہ اس کی تائید نہیں کرتے اور پروفیسر ظہور الدین کی تنقید نگاری کے حوالے سے یہ ایک بے حد اہم بات ہے جس سے ان کی Originality ظاہر ہوتی ہے۔ ورنہ آج عام طور پر تنقید کے نام پر درسی اور تقلیدی نوعیت کی تحریریں ہی سامنے آرہی ہیں۔ ان سے نہ تو ادب کا بھلا ہو رہا ہے نہ ادیب اور قاری کا۔

پروفیسر ظہور الدین نے گزشتہ تیس چالیس برسوں میں ڈرامہ، تاریخ، افسانہ، شاعری اور زبان کے مختلف پہلوؤں پر کبھی شخصیات تو کبھی رجحانات ونظریات کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے۔ اتنا، شاید بہت سارے پروفیسروں نے پڑھا بھی نہیں ہوگا۔ جموں میں اُردو زبان کا آغاز و ارتقاء ان کی شاہکار تحقیقی تصنیف ہے۔ لیکن پروفیسر ظہور الدین نے اپنی تازہ ترین کتاب "تنقیدی مباحث و تجزیئے" میں شامل مضامین میں بے پناہ علمیت پر مبنی صرف اور محض اپنی تنقیدی بصیرتوں کا مظاہرہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ مستند شخصیات، نظریات اور اصولوں کے ردِ تشکیل یا تشکیل جدید کے حوالے سے تیکھے اور نوکیلے مباحث کے دشتِ امکاں میں کھلے سر اور ننگے پاؤں داخل ہونے کی کوشش بھی کی ہے۔ پروفیسر ظہور الدین کی کتاب "تنقیدی مباحث و تجزیئے" میں شامل ۱۴ر مضامین، نہ صرف مضامین نہیں عرفان و آگہی کے ۱۴ر طبقات ہیں جن میں افلاطون اور ارسطو کے نظریات شعر، Thories of mimesis , Katharsis & Aesthestics سے لے کر عصری نظریاتی مباحث مثلاً ہیئت پسندی Formalism ساختیات

Structurlism ساختیت Textuality تانیثیت پسندی (Femisnism) نو مارکیست (Neo Marxim) اور نو تاریخیت (Neo Hsitoriscim) وغیرہ سے متعلق پروفیسر ظہور الدین کے اپنے Digested افکار و خیالات کہیں شعوری کہیں لاشعوری طور پر کبھی وضاحتاً تو کہیں اشارتاً سامنے آتے ہیں۔ لیکن ظہور الدین کی ہر رائے نہ صرف پختہ ہے بلکہ اکثر تلوار کی دھار کی صفت بھی رکھتی ہے۔ ان مضامین میں موجود پروفیسر ظہور الدین کے چند للکارتے ہوئے تنقیدی فقروں پر غور کیجئے۔

ا...... ''محسوسات کے فنی اظہار کے لئے آفاقی اصول و ضوابطہ ترتیب دینا قطعاً گمراہ کن ہے...... وہ لوگ جو ان ضوابط کو اپنے اوپر مسلط کر رہے ہیں وہ صرف اپنی قوم کو نہایت گمراہ کن نتائج کی طرف دھکیلتے رہتے ہیں''۔

مضمون۔ ''ادھورا سچ''۔ ص/۱۰

۲...... ''یورپ کی جدید مادی اور صنعتی تہذیب نے انسانوں کو...... خود غرض ہی نہیں بے حس بھی بنا دیا ہے...... کہ آدمی اب ماں باپ کا ہی نہیں اپنی اولاد تک کو بوجھ اُٹھانے کے لئے تیار نہیں ہے''۔

مضمون۔ ''اُردو افسانے کے نئے جہات''۔ ص/۵۶

۳...... ''عورت جب پوری آزادی کے ساتھ تخلیقی جوہر برتتی ہے تو پھر اُس کے اظہار میں ایسی حدت پیدا ہو جاتی ہے جس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کے تخلیقی جوہر کی گرمی سے ہر شے پگھلتی چلی جاتی ہے''۔

مضمون۔ ''اُردو شاعری میں نئی نسوانی آوازیں''۔ ص/۴۷

۴...... ''ماضی ایک تنگ و تاریک کوٹھری کی طرح ہوتا ہے اس میں جو گھُستا ہے وہ باہر کھلنے کے سارے راستے بھول جاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کوٹھری کی دیواروں میں ایسے دروازے یا جھروکے رکھے جائیں جن سے تھوڑی روشنی اندر آتی رہے تاکہ اندر گھسنے والے کو واپسی کا راستہ یاد رہے''۔

مضمون۔ ''ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ڈرامے کے روایت''۔ ص/۱۴۲

صاف ظاہر ہے کہ ظہور الدین کے مذکورہ بالا اقتباسات ان کی تنقیدی بالغ نظری کا ثبوت تو ہیں ہی لیکن ان کے افکار اندر سے کشمیری شعریات کی ارضیت، اخلاقیات اور علمی اور ثقافتی ورثے

کی جو سرگوشیاں نمایاں ہو رہی ہیں وہ بھی قابلِ غور ہیں۔۔

پروفیسر ظہورالدین کے ساتھ ہی ڈاکٹر برج پریمی نے بھی کشمیر کی اُردو تنقید کو وقار اور معیار بخشنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔عوام وخواص میں ڈاکٹر برج پریمی کی شناخت، ان کی منٹوشناسی کے بنا پر ہے۔۔ برج پریمی سے پہلے، منٹو پر ابوالليث صدیقی، وقار عظیم اور احمد ندیم قاسمی سے لے کر ممتاز شریں تک نے الگ الگ زاویوں سے لکھا تو بہت کچھ ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''منٹو حیات اور کارنامے'' اور ''منٹو کتھا'' سے زیادہ بہتر اور جامع کام ابھی تک سامنے نہیں آیا۔محمد یوسف ٹینگ نے بہت پہلے لکھا تھا:

''یہ بات کسی شک وشبہے کے بغیر کہی جاسکتی ہے کہ آئندہ منٹو کو اپنے دور کے چوکھٹے میں دیکھنے اور ان کی ذہنی وفاداریوں کے سوتے دریافت کرنے میں برج پریمی کے کام سے اغماض برتنا بہت مشکل ثابت ہوگا۔''

اور واقعہ یہ ہے کہ وارث علوی، گوپی چند نارنگ، عتیق اللہ، محمد صادق اور ابوالکلام قاسمی سے قطع نظر منٹو صدی کے حوالے سے اکثر لوگوں نے منٹو پر جو کچھ لکھا، اعتبار کے لئے برج پریمی سے ضرور استفادہ کیا وہ دوسری بات ہے کہ اکثر وبیشتر حضرات نے برج پریمی کا حوالہ دینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔اگر چہ وارث علوی کی تصنیف ''منٹو ایک مطالعہ'' منٹوشناسی کے باب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔لیکن وارث علوی کا یہ کارنامہ برج پریمی کے منٹو مطالعات کے بعد سامنے آیا ہے۔

منٹو سے قطع نظر برج پریمی کی دیگر تصانیف ''حرف جستجو''، ''جلوہ صد رنگ''، ''ذوق نظر'' ''چند تحریریں'' اور ''کشمیر کے مضامین'' میں برج پریمی ایک پختہ کار اور بالغ نظر نقاد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔قمر رئیس محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر محمد حسن اور حامدی کاشمیری، سلیمان اطہر جاوید وغیرہ نے برج پریمی کی تحقیقی وتنقیدی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ برج پریمی نے اپنے جن مقالوں میں خصوصیت کے ساتھ اپنے غیر معمولی تنقیدی شعور کا مظاہرہ کیا ہے ان میں پردیسی اور ان کے افسانے ''پریم چند اور قومی رواداری''، ''جموں وکشمیر میں اُردو افسانہ''، ''اُردو کہانی کے بدلتے رنگ''، ''قومی اور اُردو شاعری'' وغیرہ اہم ہیں۔ برج پریمی اپنی تحریروں میں بوجھل غیر مانوس اصطلاحوں اور ترکیبوں سے پرہیز کرتے ہیں، جملے بازی نہیں

کرتے، بلکہ اپنا مانی الضمیر آسان سہل اور رواں زبان میں پیش کردیتے ہیں۔ برج پریمی نے اپنی کتاب ذوق نظر کے دیباچے میں لکھا ہے:

''منٹواور کشمیر۔ یہ دونوں میرے محبوب ہیں اس لئے ان کے مختلف پہلوؤں پر لکھنا میرے لئے باعث سعادت ہے''۔

اور واقعہ ہے کہ برج پریمی کشمیر کے ایک ایسے نقاد ہیں جنھوں نے اپنی تنقیدی تحریروں میں کسی بھی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے منٹو کی دوٹوک حقیقت نگاری اور کشمیر کے عظیم تہذیبی ورثے سے ہی تحریک اور توانائی حاصل کی ہے۔ برج پریمی نے ہی سب سے پہلے منٹو کے افسانوں میں کشمیر کے حوالے سے Sociological Narration کی نشاندہی کی تھی۔ جس کو آج منٹو کا ہر نقاد دُہرا رہا ہے۔

آج کی تاریخ میں حامدی کاشمیری، برج پریمی اور ظہورالدین کے بعد کشمیر میں اُردو تنقید کی رفتار سُست ہوئی۔ لیکن چند گنے چُنے لوگوں کی جو تنقیدی تحریریں سامنے آئی ہیں وہ تنقید کے متوازن اصولوں معیار اور طریقہ کار کی بنا پر اہم ہیں۔

آج اُردو ادب کا پورا منظر نامہ (paradigm) بدل چکا ہے ترقی پسندی، جدیدیت اور ما بعد جدیدیت سے بھی آگے۔ زبان وادب سے متعلق تمام سابقہ روایت اور مفروضیات کے آگے کئی کئی سوالیہ نشانات لگ چکے ہیں۔ کشمیر سے باہر معاصر اُردو تنقید میں نظام صدیقی، ابوالکلام قاسمی، شافع قدوائی، کوثر مظہری اور مولیٰ بخش وغیرہ تنقید نگاری کے عمدہ نمونے پیش کررہے ہیں لیکن ان کی تنقیدی نگارشات میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی فلسفانہ موشگافیاں زیادہ ہیں۔ جن سے ادب کی علمیت تو منشرح ہوتی ہے ادب کی ادبیت اور تہذیب کم ہی سامنے آتی ہے۔ لیکن ان کے برعکس جموں وکشمیر کے نئے قایدین (جواب اتنے نئے بھی نہیں رہے) مثلاً مجید مضمر (اُردو کا علامتی افسانہ، کشمیری ڈرامہ اور فکشن) پریمی رومانی (جدید اُردو شاعری، ردِعمل اوراق، وراثت، تاثرات، فکرو نظر) مشتاق وانی (اُردو ناول میں تہذیبی بحران، آئینہ در آئینہ، اعتبار ومعیار، اُردو ادب میں تانیثیت) نصرت چودھری (فیض احمد فیض روایت اور انفرادیت، اُردو کے چند اہم افسانوں میں تنقیدی جائزہ) اسداللہ وانی (جموں وکشمیر میں اُردو افسانہ، کرشن چندر ایک مطالعہ، احمد جمال پاشا، میکش کاشمیری) ڈاکٹر شفق سوپوری (اُردو غزل اور نذیر آزاد) (کشمیر امکانات) وغیرہ کی تصنیفات کا جائزہ لیں تو

معلوم ہوگا کہ ان کی تنقیدی تحریروں میں جدید ترین تنقیدی نظریات، اسالیب اور رویوں کی آگہی تو ہے لیکن ان کا ذہن تقلیدی نہیں اختراعی ہے۔ جموں وکشمیر کے ان سبھی ناقدین کی کئی کئی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں، اور بحیثیت مجموعی ان کے یہاں ریاست کے رنگارنگ لسانی، ادبی اور ثقافتی سرمایہ کی بھرپور آگہی کے ساتھ ساتھ شعروادب کے تجزیہ وتحلیل کے جو تیور نظر آتے ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ کشمیر میں عبدالاحد آزاد اور نند کول طالب نے ریاست میں اُردو تنقید کی جو مضبوط بنیاد رکھی تھی اور جس پر حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، ظہورالدین اور برج پریمی وغیرہ نے قابلِ فخر عمارت کھڑی کی تھی کشمیر کے معاصر ناقدین کی تحریریں اس پر اضافہ ہیں اپنے اجتماعی لاشعور، انفرادی صلاحیت اور جموں وکشمیر کے قابلِ فخر علمی، ادبی، لسانی اور تہذیبی ورثے کی تشفی بخش آگہی کے ساتھ جو یہ سبھی لوگ تنقیدی کارنامے انجام دے رہے ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ کشمیر میں اُردو تنقید کا عصری منظرنامہ اُردو کی کسی بھی دوسری بستی سے کم تر نہیں ہے۔

☆☆☆
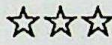
☆...... اپنی نِگارشات صاف صاف، اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ تبدیلی پتہ/ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔

(ادارہ)

ایاز رسول نازکی

کشمیر میں تواریخ نویسی

انسان بشمول تمام دیگر حیوانات اور نباتات ایک مخصوص ماحول میں بود و باش کرتے ہیں ماحول میں تغیر و تبدیلی اور ان تغیرات اور تبدیلیوں سے نبرد آزما ہونے کا عمل واقعات کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ انسانی سماج کی ترقی و بہبود کا بنیادی خاصہ یہ رہا ہے کہ انسان اور انسانی سماج اپنے ماحول میں پیدا ہونے والے تغیرات کے نبرد آزما ہونے کے فن پر دسترس حاصل کرنے میں کامیاب و کامران رہے۔ ہونے والے واقعات اور ان سے حاصل ہونے والے تجربے کو آنے والے وقتوں میں پیدا ہونے والے حالات کے لئے مشعلِ راہ بنانے کے لئے یادداشت اور حافظے نے کلیدی رول ادا کیا۔ انسان اپنی انفرادی سطح پر بھی واقعات کو یادداشت میں محفوظ کرنے پر قادر ہوا اور پھر اجتماعی سطح پر بھی ایک نسل اپنی آنے والی نسلوں تک تجربات کی وراثتیں منتقل کرنے کی راہیں تلاش کرنے لگی، اور تاریخ کو محفوظ کرنے کے پیچھے بنیادی عنصر یہی تھا۔

اوائل میں انسانوں نے واقعات کے تجربے کو محفوظ کرنے کے لئے ان واقعات میں شامل عناصر کو بصری سطح پر چٹانوں پر اتارا اور اس کے لئے علامتوں کی تشکیل کی، اور آہستہ آہستہ جوں جوں زبان مافی الضمیر کی ترسیل کا ذریعہ بنتی گئی تاریخ نے بھی زبان و بیان کا سہارہ لیا، اور ادب، شاعری اور دیگر علمی کارگزاریوں میں تاریخ لکھنے کا فن یا ہنر بھی شامل ہو گیا۔

تاریخ نویسی کی تاریخ کا مطالعہ دلچسپ ہے۔ ایک صنفِ ادب کی صورت میں بھی اور انسانی فکر اور علم کے باب کی صورت میں بھی۔ اولین منظم تاریخی فکر یا Thought قدیم یونان سے شروع ہوئی۔ Heredotus جن کا عہد ۴۲۵۔۴۸۴ قبل مسیح ہے بابائے تاریخ کہلائے جاتے ہیں۔ ان کی 'Histories' کی بنیاد پر ہی انہیں آگے چل کر Cicro نے یہ خطاب دیا۔

Heroedouts کے تذکروں میں انسانوں کے کردار کی اہمیت پر زور دیا گیا مگر ساتھ ساتھ رُوحانی اور ماروائی عمل دخل کو فوقیت بخشی گئی۔

آگے چل کر مقامی تاریخوں کا دور چلا۔ City-state کے حالات و واقعات بیان ہوتے رہے۔ Hifipias ofelis نے اولمپائی میڈل جیتنے والوں کی فہرستیں مرتب کیں۔ Thucj dides نے ایتھنز اور اسپارٹا کی جنگ کے تذکروں میں خالص جنگی حکمت عملی پر زور دیا اور Divine قوتوں کو اس سے باہر رکھا۔

رومنز نے بھی یونانیوں کی تقلید کی اور اوائل کے رومن تذکرہ نگاروں نے یونانی زبان میں ہی اپنی نگارشات تحریر کیں مگر بعد میں وہ لاطینی میں لکھنے لگے (Be 234- Cato(149 نے Origines لاطینی میں تحریر کی، اور پھر سیاست دان اور مقرر (BC Ciro(106-43) آغاز کیا (63 BC-24 AD Strato) نے شاید پہلی جیوگرافی اور ہسٹری کو ساتھ ساتھ بیان کی۔

Livy (59BC-17AD) نے روم کو ایک City state سے سلطنت بنتے دیکھا اور اسے تحریر کیا۔ Livy شاید پہلا مورخ تھا جس نے متبادل تاریخ کا نظریہ پیش کیا، اور اس کے لئے مثال یہ پیش کی کہ اگر سکندر اعظم روم کو اپنا ہدف بناتا تو کیا ہو سکتا تھا۔

سوانح عمریاں لکھنے کا رواج بھی شروع ہوا اور یہ بھی تاریخ نویسی کا ایک جز قرار پایا۔

دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی تاریخ نویسی کی ابتداء ہو چکی تھی۔ چین Spring of Autum Annals کے عنوان سے 'Lu' ریاست میں سرکاری کام کاج کے گوشوارے لکھے گئے (722-481) قبل مسیح۔ کئی لوگ انہیں Confusion کے تحریر کردہ بتاتے ہیں۔ اسلامی دنیا میں ابوالحسن الہمدانی جو یمن سے تھے اور جن کی وفات ۹۴۵ عیسوی میں ہوئی اور عبدالطف البغدادی (11621231) اور ال ادریس مصری (d1251)۔ ان تینوں اصحاب نے آثار قدیمہ کا علم حاصل کرنے کے لئے طریقے وضع کئے۔ (1342-1406) ابنِ خلدون جنہیں باتفاق رائے Father of philosophy history قرار دیا جاتا ہے۔

اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'مقدمہ' میں تاریخ اور ریاست کے مابین بنیادی اصول وضع کرنے کے لئے پہلے شخص تھے۔ اسی طرح ان کی کتاب ''العباد'' یا نصائح کی کتاب' میں بھی تاریخ

کے متعلق بنیادی مسائل پر بحث ہوئی۔ تہذیبوں کے عروج وزوال سے متعلق عوامل، اور تاریخ کو سمجھنے کے متعلق طریقے جو انہوں نے پیش کیئے آج بھی مشعلِ راہ مانے جاتے ہیں۔ انہیں عرب ہسٹر یوگرافی کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ 'مقدمہ' میں انہوں نے عسکری تاریخ یا 'ملٹری ہسٹری' کے بارے میں بھی کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔

اب ذرا کشمیر کی طرف:- کشمیر شاید برصغیر کا واحد علاقہ ہے جہاں تاریخ نویسی کی بنیاد پر ہی لگ بھگ پانچ ہزار سال تک کی قدیم تاریخ دستیاب ہے۔ اہلِ کشمیر اپنے خلاف اذہان اور زبان دانی کے لئے لگ بھگ ہر دور میں مشہور بھی رہے اور معروف بھی ہوئے۔ یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ فلسفہ، شاعری، ادبیات، جمالیات، رقص، موسیقی، ریاضی، گرامر اور دیگر علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی میں بھی ابتدا سے ہی مصروف بھی رہی اور ممتاز بھی ہوئی۔ قدیم زمانوں میں تحریریں سلامت رکھنے کے طریقے نہ ہونے کے سبب وہ سب آج ہمارے پاس دستیاب نہیں جو ہمارے پیش روؤں نے اپنے اپنے زمانوں میں راتوں کی نیندیں اور دنوں کا چین قربان کر کے معرضِ وجود میں لایا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے جتنا کم قلیل زمانے کے سرد و گرم سے بچ کر ہمارے پاس پہنچا وہ بھی اس قدر ہے کہ کوئی بھی قوم اس پر ناز کرے۔

(1149-50AD) کلہن اپنی مشہور زمانہ تاریخ راج ترنگنی میں جن حوالہ جات ذکر کرتا ہے ان کی تعداد گیارہ تواریخیں ہیں جو کلہن کے پیش روؤں نے تحریر کی تھیں اور جو کلہن کو اپنی کتاب لکھتے وقت دستیاب تھیں، اور ان گیارہ کتابوں کی بدولت ہی وہ ماقبل کے ہزاروں سالوں کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے علاوہ وہ نیل مت پوران کا بھی حوالہ درج کرتا ہے جو خوش قسمتی سے زمانہ حال تک پہنچی ہے۔ کلہن کے بارے میں یہ کہنا بھی شاید اشد ضروری ہو کہ اس کی لکھی راج ترنگنی، اس کے دور میں ہندوستان اور اس کے ارد گرد لکھے جانے والے تاریخی تذکروں سے بالکل مختلف ہے، اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ کلہن کسی طرح سے ان طریقوں سے واقف ہو چکا تھا جو طریقے عربی تاریخ دانوں نے ترکی تک پہنچا دیئے تھے اور جس کی بنیاد Objectivity پر تھی اور جس میں شاہوں اور شاہنشاہوں کے تذکروں کے ساتھ ساتھ سماجی سطح پر بھی کہیں نہ کہیں یہ بات ہوتی تھی۔ کلہن کے بعد یکے بعد دیگرے چار اس کے شاگرد منصہ شہود پر آئے اور راج ترنگنی کے سلسلے کو آگے بڑھاتے گئے۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ہندو راجاؤں کے

بے دخل ہونے اور مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہونے کے بعد لگ بھگ ایک سو سال تک سنسکرت استعمال میں رہی اور درباری مورخوں نے راج ترنگنیاں سنسکرت میں لکھنے کا کام بھی جاری رکھا۔ ان راج ترنگنیوں کے منصفین اور ان کے ادواریوں ہیں:

مدت...... کلہن......(AD ۵۰_۱۱۴۹)

مدت......۶۱ سال ۱۴۵۹_۱۳۹۸...... جون راجہ "راجاولی"

۲۷ سال......۱۴۹۵ اشری وارا...... جینا راجہ ترنگنی۔

۲۷ سال......۱۵۱۳_۱۴۸۶ پرجیا بھتا......

۲۵ سال......AD ۱۵۳۸_۱۵۱۳ سلطان فتح شاہ کے دور تک لے جاتا ہے۔

کلہن_۶۳۹۸ سال......۸۳۰ ۷ شلوک۔

جون راج_۳۰۰ سال......۹۷۶۔

سری وارا_۲۷ سال......۲۲۴۱

سوکا_۲۵ سال......۳۹۸ رشلوک

وقت گزرتا گیا اور بالآخر سنسکرت زبان دربار سے رخصت ہوئی اور فارسی نے اس کی جگہ لے لی۔ اب فارسی تاریخ نویسی کی ابتدا ہوئی اور یکے بعد دیگرے ایک لمبی فہرست فارسی تاریخوں کی سامنے آتی گئی۔ شاید سب سے اولین فارسی زبان میں لکھی گئی کشمیر کی تاریخ ہے تاریخِ کشمیر مصنف سید علی۔ (1579-AD) کم سے کم ڈیڑھ دو درجن ایسی تاریخیں ہماری دسترس میں ہیں جو سید علی کی تاریخ کے بعد رقم کی گئیں۔ ان کے علاوہ سفرنامے، یادداشتیں، روزنامچے اور دیگر تاریخی اعتبار سے اہم دستاویزات بھی موجود ہیں۔ فارسی زبان میں لکھی جانے والی شائد آخری تاریخ غلام محی الدین کی ۱۹۰۰ عیسوی میں لکھی گئی تاریخ ہے۔ سترہ اٹھارہ تواریخوں میں سے کم سے کم دو بہت عرصہ پہلے شائع ہوئیں۔ ایک واقعاتِ کشمیر از محمد اعظم دیدہ مری اور دو جلدوں میں پیر غلام حسن کھویہامی کی تاریخ حسن۔ ان کے علاوہ بہارستانِ شاہی، مصنف نامعلوم (اگرچہ کئی لوگ اسے سید محمد مہدی کی تصنیف مانتے ہیں) شائع بھی ہوئی اور انگریزی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ (کاشی ناتھ پنڈتا)۔ دیوان کرپارام نے ڈوگرہ شاہی کے متعلق آب نامہ بھی فارسی میں ہی تحریر کیا اس کے ترجمے بھی دستیاب ہیں۔

فارسی زبان میں لکھی گئی تواریخ کم وبیش سب کی سب ایرانی تاریخ نویسی کے ہی طریقوں پر رقم کی گئی ہیں، اوراس سے یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ ان مورخوں نے ایران، ماورالنہراور ہندوستان میں لکھی جانے والی فارسی تاریخوں سے کما حقہ استفادہ کیا تھا، اور رائج الوقت سٹائل اپنایا تھا۔ لیکن ایرانی تاریخ نویسوں نے تاریخ لکھتے وقت اپنے محسنوں اور کرم فرماؤں کہ جن کے ایما پر جن کوخوش کرنے کے لئے تاریخیں لکھی جارہی تھیں، زمین آسمان کے قلابے ملائے اور مبالغہ آرائی سے جی کھول کر کام لیا۔ ایسا کشمیر میں لکھے جانے والی تاریخوں کے ساتھ نہیں ہوا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے تاریخ لکھنے والے اصحاب عام طور پر صاحبِ ثروت اورارباب حکومت کے رشتوں میں منسلک نہیں تھے۔ ان میں سے لگ بھگ سب کے سب کسی بھی سرکاری عہدے پر فائز نہیں تھے، اوراس طرح وہ اپنی تاریخ نویسی میں کسی دباؤ یا کسی مصلحت کے شکار نہیں ہوئے۔ حکومت اورارباب حکومت سے منسلک نہ ہونے سے ایک خامی بھی پیدا ہوئی وہ یہ کہ ان اصحاب کی سرکاری دستاویزات تک رسائی مشکل ہوئی۔

بہارستان شاہی (۱۶۱۴ء) عیسوی سے قبل کئی تاریخیں لکھی گئیں جن کا تذکرہ تو ملتا ہے مگر مسودے دستیاب نہیں۔ ان میں ملا نادری، قاضی ابراہیم تاریخ قلمروئے کشمیر ان کا باپ خانقاہ معلےٰ کا متولی تھا (۱۵۱۴۔۱۵۰۵) اور ملاحسن قاری کے نام لئے جاتے ہیں۔ اب فارسی زبان میں لکھی گئی تاریخوں کو Summarize کرتے ہیں۔

۱۔ تاریخِ کشمیر۔ سید علی ۱۵۷۹عیسوی۔

۲۔ تاریخِ کشمیر۔ ملاحسین نادری

(۳) تذکرۃ العارفین۔ ملاعلی رینہ۔ ۱۵۸۷

(۴)۔ تاریخِ کشمیر۔ جون راج کی راج ترنگنی کا ترجمہ ۱۵۹۰ ترجمہ کار نا معلوم۔

(۵) طبقاتِ اکبری۔ نظام الدین تراوی۔ ۱۵۹۰۔

(۶) تاریخِ رشیدی۔ مرزا حیدر دغلت۔ ۱۵۴۴عیسوی۔

(۷) بابرنامہ۔ ظہیرالدین بابر۔

(۸) تاریخ فرشتہ۔ محمد قاسم فرشتہ۔ مغل دور۔

(۹) تاریخِ کشمیر۔ سید علی بن محمد، متولی خانقاہ معلےٰ ۳۷۔۱۵۳۰

(۱۰) تاریخ کشمیر۔ ملا حسین قاری۔ ۱۵۸۰

(۱۱) منتخب التواریخ۔ حسن بیگ۔ اکبر کے دور میں لکھی گئی

(۱۲) تاریخِ کشمیر۔ مرزا حیدر ملک چاڈورہ۔ ۲۰۔ ۱۶۱۷

(۱۳) بہارستانِ شاہی۔ نامعلوم۔ سید محمد مہدی سے بھی منسوب ہے۔

(۱۴) منتخبِ التوارخ۔ نرائن کول عاجز ۱۷۱۰ء۔

(۱۵) واقعاتِ کشمیر۔ یا تاریخ اعظمی۔ خواجہ محمد اعظم کول، دیدہ مری۔

(۱۶) گوہر عالم۔ ابولقاسم محمد اسلم منیمی، ولد خواجہ اعظم دیدہ مری۔

(۱۷) شاہنامۂ کشمیر۔ شمیم۔ ملالال محمد توفیق، محمد جان شاکی، ملا حسن، علی خان متین، رحمت اللہ تو ید وغیرہ۔ یہ گورنر کشمیر راجہ سکھ جیون مل کی ہدایت پر احمد شاہ درانی کے دورِ اقتدار میں تحریر کروائی گئی تھی۔ (Project incomplete)

(۱۸) باغِ سلیمان۔ از میر سید اللہ شاہ آبادی۔ ۱۷۸۰ء۔

(۱۹) تاریخ مولوی ہدایت اللہ متو۔ اسے تکمیلہ تاریخ اعظمی بھی کہتے ہیں۔ ۱۷۹۱ء۔

(۲۰) وقائع نظامی۔ از نظام الدین محمد شاہ مفتی ۱۸۲۴ء۔

(۲۱) تاریخِ کشمیر۔ مولوی خیر الدین۔

(۲۲) لب التواریخ۔ بہاؤ الدین خانیاری۔ ۱۸۲۷ء۔

(۲۳) تاریخ کشمیر۔ پنڈت بیربل کاچرو۔ مختصر التواریخ اور مجموعۃ التواریخ، مجموعات التواریخ۔ ۱۸۳۵ء۔

(۲۴) خلاصہ التواریخ۔ مرزا سیف الدین بیگ۔ ۱۸۵۷ء۔

(۲۵) تاریخ کشمیر۔ ملا محمد خلیل مرجانپوری۔

(۲۶) تاریخ کشمیر۔ عزیز اللہ قلندر۔ (گلاب سنگھ کا دور

(۲۷) گلزارِ کشمیر اور گلاب نامہ۔ دیوان کرپا رام۔ ۱۸۶۵

(۲۸) تاریخ کشمیر۔ پیر حسن شاہ کھویہامی (۱۸۹۸۔ ۱۸۳۲ء) اب ذرا اُردو میں لکھی گئی چند تاریخوں کا ایک سرسری جائزہ لیں۔ پنڈت ہر گوپال ختہ نے گلزارِ کشمیر کے نام سے تاریخ کشمیر قلمبند کی اور پیشِ لفظ میں اس بات کا ذکر کیا کہ سنسکرت اور فارسی زبان میں بے شمار کتابیں اس

موضوع پر دستیاب ہیں مگر اُردو زبان میں کوئی بھی نہیں۔ انہوں نے اولاً جغرافیہ کشمیر کے عنوان سے ۱۸۷۵ء عیسوی کے آس پاس لکھنو سے پہلی کتاب شائع کروائی اور پھر دو سال بعد جغرافیہ اور تاریخ دونوں موضوعات کو یکجا کر کے ''گلزارِ کشمیر'' ۱۸۷۷ء میں شائع کی۔ اس کے بارے میں خود تحریر کرتے ہیں۔ ''۱۹۳۱ بکرمی میں اس ناچیز نے ایک مختصر جغرافیہ کشمیر کا لکھا تھا جو کہ مطبع 'بہار کشمیر' لکھنو میں چھپا تھا۔ اُس کے نامکتفی ہونے کے باعث دل کو یہ شوق پیدا ہوا کہ تواریخ کشمیر زبانِ اُردو میں جو کہ فی زمانہ مروج اور زود فہم ہے۔ بشمول جغرافیہ کشمیر جو اَب تک ہندوستانی زبانوں یا فارسی میں کسی نے لکھا نہیں ایسا تیار کروں جس کے پڑھنے سے ناظرین کو سطح کشمیر کا حال اس طرح پر معلوم ہو سکے کہ آیا وہ کشمیر میں پھر کے سیر کر رہے ہیں اسی غرض سے بامراد پنڈت داموددر صاحب (جو اس وقت فضیلت ولیاقت کے باعث شہرِ علم سنسکرت کے آفتاب ہیں کتاب لاجواب، راج ترنگنی منصفہ کلہن پنڈت کو جو کہ معتبر اور پرانی تواریخ کشمیر سے ترجمہ کیا اور تاریخ کشمیر نرائن کول اور بیربل کاچرو و مرزا حیدر گلزار کشمیر و سفر نامہ داہن صاحب و مور کرافٹ صاحب وغیرہ و تاریخ فرشتہ وغیرہ کتب کو از سرتا پا دیکھا' ہرگوپال خستہ کے اس بیان کے باوجود ۱۸۶۴ء میں تحفۂ کشمیر کے عنوان سے گنیش لال منشی کی کتاب بھی شائع ہو چکی تھی جو شائد خستہ کی نظر سے نہیں گزری تھی۔

ان کے بعد اُردو زبان میں بھرپور کاوش منشی محمد دین فوق نے کر دکھائی۔ انہوں نے مکمل تاریخِ کشمیر ۱۹۱۰ء میں شائع کروائی۔ اس کے بعد قبل اور یکے بعد دیگرے کئی کتابیں سامنے آئیں۔ رہنمائے کشمیر ۱۹۲۳ء، سفر نامہ کشمیر ۱۹۰۷ء۔ تاریخ بڈشاہی ۱۹۴۴ء، تاریخِ اقوامِ کشمیر تین جلدیں، خواتینِ کشمیر، کشمیر کی رانیاں اور للہِ عارفہ کئی دوسری کتابیں ہیں۔ گلاب نامہ، مزارِ شہدا، کشمیر کا نادر شاہ اور راجہ سکھ جیون مل قلمی نسخے شاہد ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئے۔

اس دوران انگریزی زبان کا رواج بھی عام ہوتا گیا اور کشمیر سے متعلق انگریزی زبان میں کئی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ ان کے مضامین ''کشمیری اور غیر کشمیری دونوں تھے۔ کشمیریوں میں پنڈت آنند کول بامزی کی ضخیم کئی جلدوں پر پھیلی ہوئی تاریخ History of Kashmir شامل ہے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۲ء تک اس کے علاوہ انہوں نے کشمیر سے متعلق موضاعات پر کئی کتابیں تحریر کیں۔ جی۔ ایم۔ ڈی۔ صوفی کی دو جلدوں میں ''کشمیر'' ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے انگریزی میں لکھنے والے اصحاب میں پنڈت

پریم ناتھ بزاز، پروفیسر جیالال کول، پنڈت ایس کے این دھر، پنڈت گواشہ لال، رام چند کاک وغیرہ شامل ہیں۔ پچھلی چند دہائیوں میں تاریخ کشمیر کے بارے میں اہم کارنامے انجام دینے والوں میں حال ہی میں وفات پانے والے پروفیسر اسحاق کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس طرح انگریزی زبان میں لکھنے والوں میں فدا محمد حسنین بھی معروف ہیں۔

چراغ حسن حسرت نے ''کشمیر'' عنوان سے ۲۴۰ رصفحات پر پھیلی ایک مختصر مگر جامع کتاب تحریر کی اور اسے ۱۹۴۸ء میں لاہور سے شائع کروایا، اور تقسیم کے بعد تاریخِ کشمیر کے موضوع کو لے کر کتابیں شائع کروانے میں کئی اور نام مشہور و معروف ہیں۔ ان میں رشید تاثیر کی ۱۲ جلدوں پر مشتمل تحریکِ حریت کے حوالے سے کتاب بھی شامل ہے، اور اسی طرح شبنم قیوم کی کتاب 'کشمیر کا سیاسی انقلاب' کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ پیر افضل مخدومی، مرزا افضل بیگ اور تحریکِ حریت سے وابستہ کئی بزرگوں نے پچھلے ساٹھ ستر برسوں کے حالات و واقعات کے بارے میں کئی مضامین قلمبند کئے ہیں۔ سید علی شاہ گیلانی نے اپنے تجربات کے حوالے سے سیاسی واقعات و حالات قلمبند کئے ہیں اور ان کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ کی سوانح عمری 'آتشِ چنار' جو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں شائع ہو چکی ہے' ریاست کے شخصی راج سے آزادی، تقسیم وطن اور اس کے بعد کے حالات و واقعات کا ایک اہم تذکرہ ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر کرن سنگھ کی آپ بیتی، میر قاسم کی اپنی داستان، وغیرہ کتابیں بھی کشمیر کے سیاسی پس منظر کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

ریاستِ جموں و کشمیر کی تقسیم کے بعد سے لائن آف کنٹرول کے اُس جانب بھی کشمیر کی تاریخ قلمبند کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس ضمن میں کئی تصانیف قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) کشمیر تاریخ کے آئینے میں ...... ایم۔ اے۔ خان۔

(۲) فتح کشمیر ...... ایم عبدالرحیم افغانی سنہ ۱۹۴۰ء۔

(۳) مسئلہ کشمیر ...... پروفیسر محمد عارف خان، میرپور۔

(۴) کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی ...... پروفیسر محمد سرور عباسی سنہ ۱۹۹۲ء

(۵) اَوراقِ جموں و کشمیر ...... پروفیسر نذیر احمد تشنہ سنہ ۱۹۹۹ء۔

(۶) تاریخ کشمیر۔ سنہ ۲۰۰۶ء۔

(۷) جموں و کشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں ...... جی ایم میر ۲۰۰۱ء۔

(۸) شورِ کشمیر ۲۰۰۴ء

(۹) کشمیر ...... چراغ حسن حسرت ۲۰۰۳ء لاہور۔ (کئی بار شائع شدہ)

(۱۰) کشمیر کی جدوجہد آزادی ...... سید شاہد حسین نعیمی ۲۰۱۲ء۔

(۱۱) تاریخ کشمیر ...... سردار غلام محمد خان ۲۰۰۸ء۔

(۱۲) کشمیر کی جنگِ آزادی ...... سردار محمد ابراہیم خان ۲۰۰۷ء۔ (کئی ایڈیشن شائع ہوئے)

(۱۳) تاریخِ کشمیر ...... محمد عبداللہ قریشی۔ اور ان کے علاوہ محمد یوسف صراف وغیرہ کی کشمیرز فائٹ فار فریڈم اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوئی۔ ۱۹۷۹ء

نوٹ۔ صاحبِ مقالہ اعتراف کرتے ہیں کہ موضوع کی وسعت کے باعث کئی اہم نام اور کئی اہم کتابیں رہ گئی ہوں گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر پریمی رومانی

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو ڈراما

ڈراما ایک قدیم صنف ہے۔ سنسکرت میں اس کا ذکر ویدک عہد میں ملتا ہے۔ کالی داس کے ڈرامے میگھ دوت اور شکنتلا آج بھی سنسکرت ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مغرب میں یونانی ڈرامے کو جب فروغ ملا تو یہ صنف ارسطو کے زمانے تک آتے آتے بقائے دوام کے مرتبے تک جا پہنچی۔ البتہ اس بات میں دو رائے نہیں کہ رومن عہد میں اس صنف کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔

ڈراما کیا ہے؟ اور یہ کیسے عوام کے لئے دِلچسپی کا باعث بن گیا۔ اس کے بارے میں بعض محققین کا خیال ہے کہ ڈراما کسی واقع کی داستان یا قصے کو عملی طور پر پیش کرنے کا فن ہے اور قصے کی تشکیل ڈرامے کو دلچسپ یا غیر دلچسپ بنانے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ اصل میں ڈراما حرکت اور عمل کا نام ہے۔ ارسطو نے اس عمل کو نقل قرار دیا ہے۔ جب بھی ڈراما کی ترقی و ترویج پر غور کیا جاتا تو یونانی ڈرامے کے دو اہم پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ تریجڈی یعنی المیہ اور کامیڈی یعنی طربیہ۔

اُردو ڈراما اگرچہ تاخیر سے پیدا ہوا لیکن اس کو ترقی دینے میں ڈراما نگاروں اداکاروں، پیش کاروں اور موسیقاروں کے رول کو صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اُردو ڈراما کے عناصرِ خمسہ کی بات ہو تو بھانڈوں کی نقل کا ذکر بھی سامنے آجاتا ہے۔

بھانڈ کشمیری الاصل تھے۔ جو ہر روپ بدلنے میں کمال رکھتے تھے۔ یہ شادی بیاہ یا دیگر تہواروں کے موقعے پر کرتب دکھانے میں ماہر تھے۔ حاضر جوابی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اُنہیں بھگت یار بھی کہا جاتا تھا۔ عوام کو تفریح کا سامان بہم کرنے میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ اکثر یہ لوگ کسی مشن کے بغیر فی البدیہی مکالموں کے ساتھ اپنا کرتب دکھاتے اور خاص و عام کو تفریح کا سامان بہم

پہنچاتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اگرچہ یہ فن اب ماند پڑ گیا ہے لیکن کشمیر کے اکین گام اور واتھورہ علاقے میں بھانڈوں کے بیسوں خاندان آباد ہیں جو اب بھی کبھی کبھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے خوب صورت لڑکے خواتین کا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ اُس زمانے میں ایک قسم کا چلتا پھرتا تھیٹر کہلاتا تھا۔ ملا غنیمت کی فارسی مثنوی ''نیرنگِ عشق'' کے مطابق ''یہ پیشہ ور بھانڈ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سلطنت میں گانے بجانے اور نقلیں کرنے کا پیشہ کرتے تھے۔ یہ طائفے عموماً بازاروں میں گھومتے پھرتے اور دوکانوں کے سامنے یا بازار کے چوک میں نقلیں کیا کرتے تھے۔ تماشے کے اختتام پر ایک ایک روپیہ دو دو روپیہ دے کر ان کا حق خدمت ادا کرتے۔ اس طرح سے یہ لوگ اپنی روزی کماتے تھے۔''[1] اُردو اصناف (نظم ونثر) کی تدریس مرتبہ او مکار کول مسعود سراج ص ۔۲۴۱

سوانگ، رام لیلا، کرشن لیلا، کٹھ پتلیاں، نوٹنکی بھی زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی تفریح کا باعث بن گئے اور اس طرح سے ڈراما کے فن کی ابتدائی نمونے سامنے آجاتے ہیں۔

ڈرامے کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے ہاں ڈراما نگاری کی تاریخ بہت پرانی ہے کیونکہ زمانۂ قدیم میں بھی ہمارے یہاں رقص کی محفلوں کا چلن رہا ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح ڈرامے کے ساتھ ہے۔ کلہن نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف راج ترنگنی میں اندر پر بھار قاصہ کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ اس طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں لوک تھیٹر ترقی یافتہ شکل میں موجود تھا۔ بودھ بُت اور سوم پنڈت عہدِ بڈشاہی کے منجھے ہوئے ڈراما نگار تھے جنہوں نے سنجیدگی سے ڈرامے کی طرف توجہ کی۔

جہاں تک ریاست جموں وکشمیر کا تعلق ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں پہاڑی ڈرامے کے خدوخال صحیح معنوں میں اُبھرنے لگے جب راس لیلا کا چلن ہوا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷۔۸۵) کلچرل تہذیب تمدن اور ادب کے شائق تھے۔ اُن کا عہد علم وفن کی قدر ومنزلت کا عہد تھا۔ انہوں نے ریاست میں ایک لابریری، ایک سنسکرت کالج کے ساتھ ساتھ ایک دارالترجمہ قائم کیا تھا۔ اس طرح سے عوام نئے نئے فنون سے آگاہ ہونے لگے۔ وہ مغربی فنون سے بھی آشکار ہونے لگے۔ سنسکرت زبان کے کئی شاہ پارے انگریزی، ڈوگری، فارسی، عربی کے علاوہ اُردو زبان میں منتقل کئے گئے۔ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ (۱۸۸۵ء) تخت نشین ہوئے۔ وہ

بھی علم وادب کے بڑے پرستار تھے۔ اُن کے عہد میں ریاست کے مخلوط کلچر تہذیب، تعلیم اور فن کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ اُردو زبان کی ترقی کے دروازے وا ہوئے۔ اسی دوران ۱۸۸۹ء میں اس زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ مختلف اصناف کی طرف توجہ دینے کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی لکھے جانے لگے۔ لیکن صحیح معنوں میں اس فن کا آغاز اُس وقت ہوا جب ریاست کے بعض نوجوان جو ملازمت یا تجارت یا سیر وتفریح کے لئے ریاست سے باہر جاتے تھے اور فرصت کے اوقات میں اُنہیں وہاں ہندوستانی تھیٹر ڈرامے دیکھنے کا موقعہ فراہم ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ شوق اُن کے دل میں گھر کرنے لگا۔ اُنہیں بھی اسٹیج سے کافی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ واپس آکر وہ بھی اکثر ریاست میں ڈراما کھیلنے کی کوششوں میں مصروف ہونے لگے تھے۔ اس طرح سے ریاست کے گرد ونواح میں ڈرامے اسٹیج کرنے کی کوشش کی گئی۔ مہاراجہ کی تاجپوشی کے وقت ممبئی سے الفریڈ تھیٹر کمپنی کو جموں میں ڈراما پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ پرانی منڈی کے علاقے میں ایک ڈراما کھیلا گیا۔ جس کی مقبولیت دیکھ کر مہاراجہ بے حد متاثر ہوئے۔ اُنہوں نے اسی طرح کے ڈرامے سرینگر میں بھی پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ گاؤ کدل کے علاقے میں ایک اسٹیج قائم کیا گیا۔ اُن دنوں پارسی تھیٹر کی ہندوستان بھر میں دھوم تھی۔ ریاست میں اس کی تقلید میں جو تھیٹر کمپنیاں کام کرنے لگیں، اُن میں مہاراجہ کمپنی، رام ناٹک کمپنی، امیچور ڈراما کمپنی، کشمیر تھیٹر، اور سرسوتی ڈراما کمپنی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں، جنہوں نے بعد کے برسوں میں اپنی صلاحیت سے ایک نئی فضا قائم کی۔ اس طرح سے ریاست میں باضابطہ طور پر تھیٹر کی شروعات ہوگئی۔ چنانچہ ڈراما نویسوں، پیش کاروں، اداکاروں کا ایک طویل سلسلہ سامنے آیا۔ اُردو ڈرامے کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی جانے لگی۔ بیتاب بنارسی، ماسٹر رحمت اللہ منشی، مہدی حسن، احسن لکھنوی، طالب بنارسی، محشر ابنالوی اور رونق بنارسی نے نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ اداکاری اور پیش کاری کے جلوے بھی دکھائے۔ اُن کے ڈرامے دیکھ کر ریاست کے فنکاروں میں بھی حوصلہ پیدا ہوگیا۔ وہ بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں سرگرم عمل ہوگئے۔ اُردو کے معروف ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری نے کئی سبق آموز ڈرامے لکھے۔ جن کو ریاست میں جگہ جگہ کھیلا گیا۔ اس طرح سے ڈراما نگاری کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اُردو چونکہ یہاں کی سرکاری زبان تھی۔ اس لئے دوسری کئی زبانوں کے معیاری ڈرامے اُردو میں منتقل کئے گئے۔ ریاست میں ڈراما نگاری کے میدان میں کئی

نام پیدا ہوئے جنہوں نے اس فن کو برتا اور خوب سے خوب تر کی جانب قدم بڑھایا۔

ریاست جموں و کشمیر میں ڈراما نگاری کو ترقی و فروغ دینے میں محمد عمر نور الٰہی کا نام سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کی تصنیف ''ناٹک ساگر'' اُردو ڈراما نگاری میں مستند حیثیت رکھتی ہے۔ محمد عمر نور الٰہی دونوں ڈراما کے فن سے واقف تھے۔ یہ دونوں حضرات اسٹیج سے بھی گہرے طور سے وابستہ تھے۔ اُنہوں نے انفرادی طور پر ہی بہت سارے ڈرامے لکھے۔ نور الٰہی نے بعض اچھے ڈراموں پر تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ ''ناٹک کتھا'' بھی محمد عمر کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ ہمہ خاندان آفتاب اور آ بیل مجھے مار، اُن کے چند اہم ڈرامے ہیں۔ جو اُنہی دِنوں نشر ہوئے۔ محمد عمر نور الٰہی نے ہندی اور سنسکرت زبانوں کے بعض قابلِ قدر ڈرامے اُردو میں بھی منتقل کیے لیکن 'ناٹک ساگر' اُن کا ایک اہم کارنامہ تصور کیا جاتا ہے جو ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اس کتاب کا بسیط قدمہ لکھا ہے۔ ایک جگہ اس کتاب کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

''ناٹک ساگر کی تقریب یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ وہ کتاب ہے جو ادیبوں اور ڈراما نویسوں اور سٹیج کمپنی تھیٹر کے ہر قسم کے متعلقین کے لئے روزنامچہ ہدایات کا کام دے گی۔

محمد عمر نور الٰہی کے ساتھ ہی ماسٹر غلام حیدر کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اُنہوں نے بھی بعض اچھے اور متاثر کن قصوں کو اپنے ڈراموں کا پلاٹ بنایا۔ بقول حبیب کیفوی وہ اپنے ڈراموں میں عوامی جذبات کی عکاسی کرتے تھے۔ جس علاقے میں بھی وہ تبدیل ہو کر جاتے تھے تو عوام کی تکالیف اور شکایات کو ملحوظ خاطر رکھ کر ڈرامے لکھتے اور پیش کرتے تھے۔ اُن کے ڈراموں کے پلاٹ عام لوگوں کے مسائل ہوتے تھے۔ اُن کے ڈرامے دیکھ کر بعض اوقات افسر بالا بھی حرکت میں آتے تھے اور عوام کے مسائل بلا کسی تاخیر کے حل کرتے تھے۔[1]

''رُکمنی ہرن'' ایک اور ڈراما ہے جو خطۂ کشمیر سے تعلق رکھنے والے ڈراما نگار، دینا ناتھ وارید، شاہد کاشمیری نے ۱۹۳۳ء کے آس پاس لکھا۔[2] یہ ایک نیم مذہبی اور نیم تاریخی ڈراما ہے جو اُس

۱: جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشو و نما از ڈاکٹر برج پریمی ص۔ ۱۰۱۔

۲: کشمیر اُداس ہے، پروفیسر ہاشمی ص۔ ۳۶۱ (تیسرا ایڈیشن ۲۰۰۰)

شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی کے خبرنامے شمارہ نمبر ۳، ۹/جون ۱۹۸۲ء یہ ڈرامہ انہوں نے خود پیش کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ڈراما کلچرل کانگریس کے اسٹیج سے پیش کیا گیا

زمانے میں روزنامہ مارتنڈ سرینگر میں قسط وار شائع ہوا۔

نرہری رائے زادہ، نرسنگھ داس نرگس، جگدیش کنول، آذر عسکری اور ایم، اے عزیز خطۂ جموں سے تعلق رکھنے والے ڈراما نگار ہیں۔ ان میں نرہری رائے زادہ کے ڈراموں کے دو مجموعے اُردو ڈرامہ اور "پرانے دیپ نئے اُجالے" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ جگدیش کنول کا ڈراما "پردے کے پیچھے، نرسنگھ داس نرگس کا تعارف اور ایم، اے، عزیز کا نوشتہ تقدیر اُس دور کے اہم ڈراموں میں شمار ہوتے ہیں۔ اِن ڈراموں کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔

ریاست کی تھیٹر تحریک کو تقویت دینے میں IPTA یعنی انڈین پیپلز تھیٹر کے رول کو کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ عوامی تھیٹر سے وابستہ بعض قلمکاروں نے بلراج ساہنی کے کہنے پر IPTA کی ایک شاخ قائم کی۔ یہ شاخ ریاست میں تھیٹر تحریک کو فروغ دینے میں کارآمد ثابت ہوئی بعد میں ایک نیا تھیٹر گروپ تشکیل دیا گیا اور بقول قیصر قلندر اس کے پیچھے مشہور فلم اداکار اور دانشور بلراج ساہنی کا ہاتھ تھا۔ اُنہوں نے ہمیں ایک تھیٹر گروپ بنانے کی اسکیم بتا دی۔ اسی طرح ریاست میں اپٹا کی شاخ قائم کی گئی۔ اس دور میں پریم ناتھ پردیسی نے غذائی بحران پر ایک کشمیر ڈرامہ "بتہ ہر" لکھا

جو بعض سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے اسٹیج نہ ہو سکا۔ چنانچہ اس سے پردیسی کا دل ٹوٹ گیا لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ وہ آگے قدم بڑھاتے گئے اور نوجوانوں کو حوصلہ دیتے رہے یہ واقعہ بعد میں تھیٹر تحریک کو آگے بڑھانے اور اس کو تقویت دینے میں کارآمد ثابت ہوا۔

۱۹۴۷ء کے المیے سے کون واقف نہیں۔ ملک تقسیم ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ سامراجی قوتوں نے سر اُٹھایا۔ چاروں طرف فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے۔ لوٹ کھسوٹ، مار دھاڑ اور قتل کا بازار گرم ہوا۔ ان حالات کو قابو میں لانا کار درد والا معاملہ تھا۔ کشمیر چھوڑ دو کی تحریک زوروں پر تھی۔ چاروں اور انتشار اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ نیشنل کانفرنس کی قیادت میں کشمیری عوام متحرک ہونے لگے۔ حکومت کی عنان عوام کے ہاتھ میں آ گئی جس کی قیادت کشمیر کے عظیم رہنما شیخ محمد عبداللہ کر رہے تھے۔ ریاست کے ادیبوں، دانشوروں اور فنکاروں نے اپنی احساسِ ذمہ داری کو پہچان لیا اور وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے لگے۔ امن و آشتی کو فروغ دینے کے لئے انہوں نے اپٹا کی توسیع کی اور کلچرل فرنٹ کے نام سے ایک انجمن بنائی۔ اس طرح سے زبان و

ادب کا احیائے نو ہونے لگا۔ کلچرل فرنٹ بعد میں آل سٹیٹ کانگریس میں منتقل ہو گیا۔ چنانچہ ادیبوں، شاعروں، مصوروں، ڈراما نگاروں اور دوسرے فنکاروں کے الگ الگ شعبے قائم کیے گئے۔ شاعری اور ڈرامے تخلیق ہونے لگے۔ اس تنظیم سے وابستہ فنکاروں میں محمود ہاشمی، راج ہنس کھنہ، پریم ناتھ پردیسی، شیودھان سنگھ چوہان، سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، قیصر قلندر، دینا ناتھ نادم، پران کشور، سمتر الکھوارا، سنتوش لکھوارا، اچلا سچدیو، درگا سنگھ اور شیلا بھاٹیہ کے نام لئے جاسکتے ہیں اس دور میں پریم ناتھ پردیسی نے کئی ڈرامے لکھے اور اسٹیج کروائے۔ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار تھے۔ اُنہوں نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا۔ اُس زمانے میں وہ رونق تخلیق کرتے تھے لیکن یہ میدان اُنہیں راس نہیں آیا۔ چنانچہ انہوں نے نثر کی طرف توجہ کی اور بڑی جاندار کہانیاں لکھیں۔ جن میں وہ کشمیر کے مفلوج الحال عوام کے درد بڑی جانفشانی سے بیان کرنے لگے۔ اسی لئے اُنہیں کشمیر کا پریم چند بھی کہا جاتا ہے۔ وہ ایک ڈراما نگار بھی تھے۔ اُن کے ڈراموں میں شہید شیروانی سوالی، قدہ گوجواری، جن کو میں کشمیری زبان میں منتقل کر کے پیش کیا گیا۔ سنگتراش وغیرہ قابلِ ذکر ہیں جو اُسی زمانے میں کھیلے گئے۔ شہید شیروانی دراصل قبائلی حملے میں ہلاک ہونے والے مقبول شیروانی شہید شیروانی کے نام سے ڈرامے لکھے گئے باقی شاعر کشمیر مہجور نے لکھے تھے۔ بعد میں جب پردیسی ریڈیو میں ملازم ہوئے تو کافی عرصہ تک جوابی حملہ کے نام سے اُن کا فیچر بھی نشر ہوتا رہا۔

پروفیسر محمود ہاشمی ریاست کے ایک قابلِ ذکر ڈراما نگار تھے۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے ڈراموں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ علی گڑھ میں حصول تعلیم کے دوران اُن کا ایک ڈراما "سیفو کا انجام" آل انڈیا ریڈیو دہلی سے براڈ کاشٹ ہوا۔ قیام سرینگر کے دران وہ بڑے سرگرم رہے۔ پردیسی کی صحبت میں رہ کر انہوں نے اپنا کلچرل فرنٹ اور کلچرل کانگریس میں کافی کام کیا۔ وہ اِن انجمنوں کے معماروں میں شمار ہونے لگے۔ اُنہوں نے اپنے ڈراموں خاکوں اور افسانوں کے ذریعے سے اپنے دل کا درد کھل کر بیان کیا ہے۔ "کشمیر یہ ہے، انار کلی کی واپسی، آنکھیں اور کیمرہ یہ ہے اُن کے یادگار ڈرامے ہیں جن میں کشمیر کے محنت کش عوام کے درد کے ساتھ ساتھ انہوں نے سماج کو لوٹنے والے درندوں کو بے نقاب کیا ہے۔ کشمیر یہ ہے، قبائلی حملے کے خلاف عوامی رائے عامہ ہموار کرنے اور قوم پرستی کے جذبے کو مضبوط کرنے کے لئے لکھا گیا ڈرامہ ہے۔ افسوس کہ اُن کے ڈراموں کی مکمل فہرست دستیاب نہیں۔ اُنہوں نے اپنی نگرانی میں کئی ڈرامے اسٹیج بھی کروائے جن

کی تفصیل وہ اپنی کتاب "کشمیر اُداس ہے" میں پیش کرتے ہیں۔ اُس درد کو یاد کرتے ہوئے وہ اپنی اسی کتاب میں رقمطراز ہیں۔

"چنانچہ ایک کے بعد ایک ڈراما ہوا۔ اور کانونٹ کی ڈرامہ شام، سرینگر کی سماجی زندگی کا ایک مقبول حصہ بن گئی۔ میں سال میں تین چار ڈرامے لکھتا جو کالج کے اسٹیج پر کھیلے جاتے۔ ڈراموں کی ریہرسل وغیرہ کے سلسلے میں میرا خاصا وقت کانونٹ میں گزرتا اور وقفہ کے دوران میں کسی شکارے میں دریا پار کر کے پردیسی صاحب کے ساتھ آبیٹھتا"۔ پروفیسر محمود ہاشمی کا ایک مقبول ڈرامہ کشمیر یہ ہے تصور کیا جاتا ہے۔ دراصل ریاست میں نئے تھیٹر کا آغاز اسی ڈرامے سے ہوتا ہے۔ اس میں مردوں کے ساتھ ساتھ زنانہ کردار پہل بار سامنے آگیا۔ آزادی کے بعد اُردو ڈرامے کے شعبے میں کافی پیش رفت ہوئی۔ نئے ڈراما نگار جوش اور ولولے کے ساتھ سامنے آئے۔ جو اپنے خونِ جگر سے اُردو ڈراما نگاری کی آبیار کرتے رہے۔ بعض ڈراما نگاروں نے اس فن میں نئے تجربے کئے اور اپنا ایک خاص مقام بنایا۔ اس دور میں جو ڈرامے کھلے گئے اُن میں "انسان جیت گیا، دھرتی اور ہم، وادیاں اور ویرانے، تمنا کے قدم، راستہ کانٹے اور ہاتھ، نئی بستی، پورن ماشی، فطرت اور انتقام، تخلیق کا گھاؤ، وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ آج کل کی مصروف ترین زندگی میں اگرچہ اسٹیج کی اہمیت کم ہونے لگی ہے اور لوگ گھر بیٹھے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ڈرامے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں لیکن پھر بھی جب کوئی اچھا ڈرامہ کھیلا جاتا ہے تو لوگ اسٹیج ڈرامے سے ضرور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اُردو ڈرامے کو فروغ دینے میں جموں و کشمیر کے ریڈیو اسٹیشنوں کا بھی زبردست ہاتھ رہا ہے۔ ریڈیو جموں ریاست کا پہلا اسٹیشن ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ریڈیو کشمیر کام کرنے لگا۔ ان دونوں اسٹیشنوں کے وجود میں آتے ہی ریاست کی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو زبان و ادب کی سرگرمیاں بھی تیز تر ہوگئیں۔ چنانچہ اُردو پروگرام باقاعدگی سے نشر ہوتے رہے۔ بعد اچھے اور معیاری ڈرامے بھی اکثر ان دونوں اسٹیشنوں سے نشر ہوتے رہے، معروف ادیب اور فلمساز خواجہ احمد عباس کا ڈرامہ "چودہ گولیاں" اولین ڈراما ہے جو ریڈیو کشمیر سے نشر ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ جن ڈرامہ نگاروں کے ڈرامے باقاعدگی سے ریڈیو سے نشر ہوتے رہے۔ اُن میں کرتار سنگھ دگل، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر شکیل الرحمن، جتندر شرما، رضیہ منظور الامین، راہی معصوم رضا، ٹھاکر پونچھی، علی محمد لون

قیصر قلندر، سوم ناتھ زتشی، بنسی نردوش، موہن یاور، حامدی کاشمیری، پشکر ناتھ، آفاق احمد اور شبنم قیوم وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان ڈراما نگاروں نے کئی سبق آموز ڈرامے لکھے جو جموں وکشمیر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتے رہے۔ ''دو یالیاں گیہوں کے، چراغ اور سائے، چنار، ساون جلے بھادوں جلے اور سفر'' وغیرہ جیسے ڈرامے قومی سطح کے مقابلے میں کامیاب قرار دیئے گئے۔ ریڈیو کشمیر سرینگر کے زیرِ اہتمام تمثیل پروگرام میں ہر سال نئے نئے ڈرامے ہوتے رہے اور ڈرامائی ہفتے کے بعد بہترین ڈراما چُن لیا جاتا ہے۔ اس طرح سے ڈراما نگاروں اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

علی محمد لون اور بنسی نردوش یوں تو کشمیر زبان کے سرآوردہ کہانی کاروں میں شمار ہوتے ہیں لیکن اُردو زبان وادب میں اُن کی خدمات کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کی جاسکتی۔ اُن کے ڈراموں میں عام طور پر پلاٹ سیدھے سادھے ہوتے ہیں۔ لون نے کشمیر کی سماجی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کو اپنے ڈراموں میں اُبھارنے کی کوشش کی۔ اُن کی ڈراموں میں تکنیک کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ بنسی نردوش کشمیر کے محنت کش عوام کی مفلسی، لاچاری اور بدحالی کو نہایت ہی شائشتہ زبان میں پیش کرتے رہے۔ لون کا ڈراما ''چراغ اور سائے، اور آدم اور حوا اور ابلیس، بنسی نردوش کا ڈراما ''ایک رات کا مہمان'' ماہنامہ شیرازہ اور ہمارا ادب میں شائع بھی ہو چکے ہیں اور مقبولیت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ بعض دوسرے ڈراما نگاروں میں دینو بائی پنت اور نریندر کھجوریہ کے نام بھی توجہ طلب ہیں۔ انہوں نے سماجی اور اصلاحی ڈرامے بھی لکھے ہیں جو بے حد مقبول ہو چکے ہیں۔

نرہری رائے زادہ اس دور کے ایک باصلاحیت ڈراما نگار ہیں۔ پرانے دیپ نئے اُجالے اُن کے مشہور ڈراموں میں شمار ہوتا ہے۔ زیڈ یسمی کے ڈرامے جہانگیر کی موت کی جھنکار اِسی دور کے کامیاب ڈرامے ہیں۔ وجے سیمی اپنے ڈرامے انگماں میں چینی حملے کی مذمت کرتے ہیں اور قومی یکجہتی اور حب الوطنی کا درس دیتے ہیں۔ ''تاج اور آدم کے بیٹے دیانند کپور کے کامیاب ڈرامے ہیں جن میں سماج کی بے راہ روی پر طنز کے تیکھے تیر چلائے گئے ہیں۔

پشکر ناتھ بھی دورِ حاضر کے ایک ممتاز ڈراما نگار ہیں۔ اُنہوں نے اپنا ادبی سفر رومانی افسانوں سے شروع کیا لیکن اُردو ڈراما نگاری کی ترقی وفروغ میں اُن کی خدمات کم اہم نہیں۔ اُن

کے ڈرامے ایک لکیر درد کی، چندر مکھی، ساون جلے بھادو جلے، دل کی وادیاں، ڈیرا، دوراہ، جانے انجانے، گھر گھر کی کہانی اور سراب وغیرہ منفرد ڈراموں میں شمار ہوتے ہیں۔ پوشکر ناتھ کے ساتھ ساتھ نور شاہ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ اصل میں وہ بھی پشکر کی طرح افسانہ نگار ہیں لیکن اُنہوں نے بعض اچھے اور فکر انگیز ڈارمے لکھے جن میں ویرانے کے پھول، دل کی بستی، وہیل چیر، چاند کے پھول، دھواں نہیں وغیرہ لکھے اور افسانوں کی طرح ڈراما نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا۔

ڈراما نگاری کو فروغ دینے میں دور درشن کا رول کسی سے کم اہم نہیں ہے۔ اگر چہ دور درشن میں پیش ہونے والے ڈرامے اسٹیج ڈراموں کی تکنیک سے مختلف ہیں، اور اس میں رنگ اور روشنیوں کے ساتھ ساتھ کیمرہ کا بھی خاص خیال رکھنا پڑتا ہے لیکن یہ ایک ایسا طاقتور ذریعہ ہے جو ہر ایک کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بہر حال دور درشن کے دونوں اسٹیشنوں جموں وکشمیر سے بے شمار ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں. جن میں اصلاحی ڈرامے بھی ہیں اور سماجی ڈرامے بھی۔ کبھی کبھی کلاسیکی فن پاروں کو بھی ڈرامائی روپ دے کر ٹیلی کاشٹ کیا جاتا ہے . جو نہایت ہی سبق آموز ہوتے ہیں۔ پریم چند، مرزا غالب، اقبالؔ، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، آغا حشرت کاشمیری وغیرہ جیسے سر برآوردہ ادیبوں، شاعروں اور ڈراما نگاروں کے فن پاروں کو بھی دور درشن کیندروں نے وقتاً فوقتاً سلیقے سے پیش کیا ہے جن کو لوگوں نے کافی سراہا۔ پشکر ناتھ، علی محمد لون، وجے سوری، نور شاہ، شبنم قیوم، وریندر پٹواری، آنند لہر، سوہن لال، شوکت شہری وغیرہ جیسے ڈراما نگاروں کے ڈرامے ٹیلی کاشت ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

اُردو ڈراما کو تقویت دینے میں جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی کی مساعی کو کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ گزشتہ برسوں سے اس ادارے نے بڑے ادبی اور ثقافتی کارنامے انجام دیئے ہیں اور ریاست کے بے شمار ادیبوں، ڈراما نگاروں، شاعروں اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ یہ ادارہ سالہا سال سے زبان، ادباء، موسیقی، رقص اور مصوری کے مختلف شعبوں کی آبیاری کرنے کے ساتھ ساتھ ڈرامے اسٹیج کرنے کے لئے مالی امداد فراہم کرتا ہے۔ ڈراموں کے بہترین مسودات پر ڈراما نگاروں کو گراں قدر اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔ مختلف تھیٹروں اور ڈراما کلبوں کو نہ صرف مالی تعاون پیش کرتا ہے بلکہ اداکاروں، پیش کاروں اور فنکاروں کو گراں قدر اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔ اس طرح سے ریاست میں بے شمار ڈرامہ کلب وجود میں آئے۔ اکیڈیمی نے ملک

کے مختلف شہروں میں وقتاً فوقتاً ڈرامے اور اوپیرا بھی پیش کئے ہیں جن میں جھیل بُلا رہی ہے، ہمالیہ کے چشمے (علی محمد لون) اور پیاباج پیالہ (زبیر رضوری) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس طرح اس ادارے نے ریاست سے باہر بھی جموں وکشمیر کا نام روشن کیا۔

عصر حاضر میں جن ڈراما نگاروں نے اُردو ڈراما کی روایت کو آگے بڑھانے اور اس کو تقویت دینے میں پہل کی اُن میں وریندر پٹواری، آنندلہر، سوہن لال، نذیر جہانگیر، شوکت شہری اور مشتاق کاک کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

وریندر پٹواری اور آنند لہر تو کہانی کار کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں لیکن انہوں نے ڈراما نگاری کو فروغ دینے میں بھی اپنا بھر پور تعاون ادا کیا۔ آنند لہر ناول نگار بھی ہیں اُن کے کئی ناول شائع ہو چکے ہیں۔ وریندر پٹواری کے موضوعات ریاست کے لوگوں کو غربت، پسماندگی اور سماجی نابرابری ہے۔ ان موضوعات کو وہ اپنے ڈراموں میں بھی بخوبی نبھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ "آخری دن" اُن کے ڈراموں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۴ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے اور مقبول ہوا۔

آنند لہر کسی تعاون کے محتاج نہیں۔ وہ بیک وقت ایک افسانہ نگار، ناول نگار اور ڈراما نگار ہیں۔ وہ انوکھے اور اچھوتے موضوعات کا انتخاب کرنے میں کوئی جواب نہیں رکھتے، گزشتہ برسوں سے اُن کا موضوع سرحد رہا ہے۔ وہ تمثیلی انداز میں لکھتے ہیں اور اپنے ڈراموں کو موثر طریقے سے آگے بڑھاتے ہیں۔ نروان، بہیسوی کون اور سرحد اُن کے بعض ڈراموں کے مجموعے ہیں جو شائع ہو کر مقبول ہو گئے ہیں۔ اُن کے کئی ڈرامے ریڈیو سے بھی پیش ہو چکے ہیں اور دور درشن سے بھی۔

شوکت شہری، سوہن لال اور مشتاق کاک بھی سنجیدگی سے ڈراما نگاری کے فن کو فروغ دینے میں پیش پیش ہیں۔

شوکت شہری سماجی اور اصلاحی ڈرامے لکھنے کے فن سے واقف ہیں۔

سوہن لال کول ڈراما لکھنے کے فن کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری کے فن سے بھی واقف ہیں۔ اُنہوں نے انگریزی کے بعض اچھے ڈراموں کو ترجمہ کر کے اسٹیج بھی کیا اور دوردرشن کے وساطت سے بھی پیش کیا۔

مشتاق کاک نے سعادت حسن منٹو کی ۷ہار کہانیوں کو تین ڈرامے کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔ دہلی اُردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام ورک شاپ میں وہ اپنے بعض ڈرامے نہایت ہی سلیقے سے پیش کر چکے ہیں. جن میں منٹو ہوں، منٹو بہ قلم خود اور سیاہ حاشیے وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

اُردو ڈراموں کو جن پروڈسروں نے اپنی محنت لگن اور بے پناہ صلاحیت سے بامِ عروج پر پہنچا دیا اُن میں پران کشور کا نام سرفہرست ہے۔ وہ خود بھی ایک اچھے ڈرامہ نگار ہیں اور ابتداء سے ہی تھیٹر تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ اُنہوں نے درجنوں ڈرامے لکھے اور ریڈیو سے پیش کیے۔ ویدراہی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ایک منجھے ہوئے فنکار ہیں۔ خود بھی ڈرامے لکھتے ہیں اور اس کو پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ فاروق نازکی، اشوک جیلخانی، تریلوک داس، مکھن لال صراف، سی۔ این۔ شرما، پیارے لال راز دھان اور سوہن لال کول کے نام اُردو ڈرامے کو فروغ دینے میں اور اس کو سلیقے سے پیش کرنے میں جواب نہیں رکھتے ہیں۔

ڈراما نگاری کے ساتھ ساتھ ڈراما کے نقاد بھی پیدا ہوئے ہیں۔ محمد عمر نور الہیٰ، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر اکبری حیدری، پروفیسر ظہور الدین، پروفیسر شکیل الرحمن، پروفیسر منظر اعظمی، ڈاکٹر برج پریمی، قیصر قلندر، ڈاکٹر طاہر عبداللہ اور ڈاکٹر اسد اللہ وانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اُردو ڈرامائی ادب میں ایسے بھی اچھے اور فکر انگیز ڈرامے ہیں جو نہ ابھی تک نشر ہوئے ہیں اور نہ ٹیلی کاسٹ اور نہ اسٹیج ہوئے ہیں، بلکہ مختلف اخباروں اور کتابوں اور جرائد میں چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ایسے ڈراموں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ ان میں بعض کلاسیکی ڈرامے ہیں اور بعض عصر حاضر کے مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان ڈراموں کو تلاش کر کے منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

مختصر یہ کہ ریاست جموں و کشمیر میں افسانہ نگاری کے مقابلے میں اس ڈرامے کی طرف گرچہ بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔ لیکن پھر بھی یہاں ایسے ڈرامے نگار پیدا ہوئے جن کے کارہائے نمایاں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆

ڈاکٹر نذیر آزاد

جموں وکشمیر میں معاصر اُردو نثر

ریاست جموں وکشمیر میں اگرچہ اُردو زبان کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے رُبعِ آخر میں اُس وقت ہوا جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد سے اِسے فارسی کی جگہ پر سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا گیا تاہم ریاست میں اِس زبان کے ابتدائی آثار سلطنتِ مغلیہ میں ہی دکھائی دینے لگے تھے۔ سولہویں صدی کے کشمیری تاجدار یوسف شاہ چک اور سترہویں صدی کی سنت شاعری روپہ بھوانی کے بارے میں مورخین کا یہ خیال ہے کہ وہ کشمیر میں ریختہ گوئی کے بنیاد گزار ہیں۔ ہمیں زین العابدین بڈشاہ کے سامنے سے ہی کشمیر اور بیرون کشمیر کے مابین وہ لسانی کشمکش نظر آتی ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف کشمیری زبان کی لفظیات مالا مال ہوئی بلکہ جس نے یہاں کے طرزِ اظہار پر بھی نمایاں اثرات مرتب کئے ہیں۔ اُردو زبان کے مقتدر اور معتبر تذکروں میں ایسے دسیوں شعراء کے نام ملتے ہیں جنہوں نے کشمیر سے ہجرت کر کے ہندوستان کے مختلف درباروں میں اپنی جودتِ طبع کا سکہ بٹھا دیا۔

ریاستِ جموں وکشمیر میں اگرچہ اُردو نثر کی ابتداء قدرے تاخیر سے ہوئی تاہم کشمیر سے باہر لاہور اور دہلی میں کشمیری نژاد نثر نگاروں نے یہاں کے سیاسی حالات کو موضوع بنا کر کئی اخباروں میں اہم تاریخی مضامین شائع کرائے تھے۔ اس کے علاوہ کشمیر کے بارے میں ان اخبارات میں بعض صاحب الرائے قلمکاروں نے بھی اپنی آراء ظاہر کی تھیں۔ اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں پر اُردو نثر کی ابتداء مہاراجہ ہری سنگھ (۱۸۵۸ء۔۱۸۸۵ء) کے عہد میں اُس وقت ہوئی جب کہ پہلے "بدیا بلاس" اور بعد میں "رنبیر" اخبار کی اشاعت ممکن ہوسکی۔ اس زرّیں عہد میں ریاست میں "دارالترجمہ" قائم ہوا۔ جس کے ذریعے مغربی علوم کو اُردو میں منتقل کرنے

کے لئے سرکاری سطح پر اقدامات اُٹھائے گئے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے مطابق اُن مخطوطات کو محکمہ تحقیق کے سابق سربراہ صاحبزادہ حسن شاہ اور انہوں نے ''رنبیر کلکشن'' کے نام سے مرتب کیا۔ بعد میں یہ مخطوطے کشمیر یونیورسٹی میں منتقل کئے گئے۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات میں جو مسودے میری نظر سے گزرے ہیں اُن میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

(۱) رسالۂ کلیاتِ رمی (تیراندازی)......میر امید الدین جیو۔

(۲) تائیدِ بصارت (در شمشیر شناسی)......لطف اللہ خان نثار

(۳) اسباب الامراض والعلامات......حکیم احمد شاہ (طبیبِ خاص، مہاراجہ رنبیر سنگھ)

(۴) بھاگوت کتھا......نامکمل

(۵) الف لیلیٰ......بخطِ جلی۔

(۶) رسالۂ مورچہ بندی۔

(۷) رسالۂ علم انگریزی......نامکمل

(۸) رسالہ کاغذ سازی......

(۹) ہدایتِ پیدائش بچہ......نامکمل

(۱۰) ترجمۂ تاریخ انگلستان......نامکمل

۱۹۲۴ء میں ملک راج صراف کے ہفتہ وار اخبار ''رنبیر'' کے اجراء کے ساتھ جہاں ایک طرف ریاست میں صحافت کا تابندہ آغاز ہوا وہیں اُردو نثر نگاری کے خاکے اُبھرنے شروع ہوگئے۔ بعد میں کشمیر میں بھی اُردو اخبارات کا طویل سلسلہ چل نکلا جو آج تک صحافتی نثر میں اپنا بھرپور حصہ ادا کر رہا ہے۔ اس کی ابتداء پنڈت پریم ناتھ بزاز نے پہلے ''وِتستا'' اور بعد میں ''ہمدرد'' کے اجراء سے کی۔ مارتنڈ، دہقان، خدمت، مسلم، جہانگیر وغیرہ اس صحافتی نثر کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں ۱۹۶۶ء کے بعد شمیم احمد شمیم نے ہفت روزہ ''آئینہ'' کے اجراء سے یہاں کی صحافتی نثر میں ادبی نثر کی چاشنی ملادی۔ شمیم کے اداریے ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ کے اداریوں کی سی شان رکھتے ہیں جن کو اُن کی ہمشیرہ نے ''آئینہ نما'' کے نام سے کئی جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ''آفتاب'' میں شائع ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' نے صحافتی نثر میں طنز و مزاح کو اُسی طرح راہ دی جس طرح شمیم احمد شمیم کے کالم ''چراغ بیگ کے قلم سے'' میں ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ کشمیر میں محکمۂ

اطلاعات کے رسالہ ''تعمیر'' اور کلچرل اکیڈیمی کے ''شیرازہ'' نے کشمیر میں ادبی صحافت کا آغاز کیا۔
ان رسائل کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے مدیرانِ اوّل شمیم احمد شمیم اور محمد یوسف ٹینگ جیسے سربرآوردہ
قلمکار رہے۔ ''تعمیر'' اگرچہ ریاستی حکومت کی کارکردگیوں کی تشہیر کے لئے مختص تھا لیکن ساتھ ہی
اس میں شاعری، افسانہ، تحقیق اور تنقید کے لئے جگہ رکھی گئی۔ اس رسالے نے کشمیر کے اُبھرتے
قلمکاروں کے لئے ایک موثر پلیٹ فارم مہیا کیا۔ شیرازہ میں ریاست سے باہر کے نامی گرامی
قلمکاروں کی نگارشات چھپتی رہیں وہیں مقامی ادیبوں کو بھی ترسیل کا موثر ذریعہ فراہم ہوا۔ ان
قلمکاروں میں نندلال کول طالب، نور شاہ وغیرہ سرفہرست ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کئی ادیبوں
نے بیرونِ ریاست شائع ہونے والے جرائد میں اپنی پہچان بنائی تھی لیکن بعض ادیب ''شیرازہ'' کی
وجہ سے ہی بیرون دنیا میں متعارف ہوئے۔

''شیرازہ'' کو اگر ایک رسالے کے بجائے اُردو کا دبستانِ جموں و کشمیر کا آفیشل آرگن کہا
جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اِس کے عام شماروں میں تہذیب، تمدن، لسانیات، آثارِ قدیمہ، خطاطی،
مشاہیر اور دوسرے موضوعات پر عالمانہ مضامین شائع ہوتے رہے۔ نیز افسانہ، انشائیہ، تبصرہ کتب
بھی تواتر اور سنجیدگی کے ساتھ چھپتے رہے۔ اس رسالے نے مشاہیر پر خصوصی گوشے شائع کئے اور
بعض اہم موضوعات پر خصوصی نمبر نکالے۔ شیرازہ کی ان خصوصی اشاعتوں میں عجایبات نمبر، اقبال
نمبر، پریم چند نمبر، مہجور نمبر، لل دید نمبر، صوفیانہ موسیقی نمبر، جموں و کشمیر لداخ نمبر، سرینگر نمبر سرفہرست
ہیں۔ گزشتہ برسوں میں اس کے شعری انتخابات نمبر، ٹینگ نمبر، فیض نمبر، میراجی نمبر، فرید پربتی
نمبر وغیرہ اُردو حلقوں میں داد و تحسین پا چکے ہیں۔ ''شیرازہ'' میں شامل وقیع نثری سرمائے کا یہاں
تفصیل کے ساتھ تذکرہ ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شفق سوپوری کا مرتب کردہ اشاریہ معاون
ثابت ہوگا۔ اسی طرح اکیڈیمی کا سالنامہ ''ہمارا ادب'' بھی کشمیر کے نثری سرمائے میں زبردست
اضافے کا موجب ہے۔ ہمارا ادب کا اشاریہ ڈاکٹر مجید حاجنی نے ایم فل کے مقالے کے طور پر
ترتیب دیا ہے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں پونچھ اور جموں سے اُردو نثر کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن کشمیر میں
مقامی ادیب اس صدی کے اواخر تک نثر نگاری سے پہلو تہی کرتے رہے۔ بعض محققین کے نزدیک
پنڈت ہرگوپال خستہ کی کتاب ''گلدستہ کشمیر'' پہلی نثری کاوش ہے۔ لیکن بقول محمد یوسف ٹینگ خستہ

کو اُن غیر ریاستی نثر نگاروں میں شامل کیا جاسکتا ہے جنہوں نے ریاست میں اُردو نثر کی داغ بیل ڈالی تھی جن میں محمد الدین فوق سرفہرست ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک عبدالاحد آزاد کا تذکرہ شعرائے کشمیر "کشمیری زبان اور شاعری" کشمیر میں اُردو نثر کی خشتِ اوّل ہے۔ چنانچہ یہ بات طے ہے کہ آزاد ۱۹۴۹ء میں عالم جوانی میں اس دنیا سے چل بسے تھے اور بعد میں اُن کی تصنیف کو مرزا کمال الدین شیدا نے محمد یوسف ٹینگ کی اعانت سے ۱۹۵۹ء میں پہلی بار شائع کیا۔ اس کے برعکس آزاد کے اُستاد غلام احمد مہجور کی کتاب "حیاتِ رحیم" (رحیم صاحب صفاپوری) ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ اس طرح مہجور کو کشمیر میں اُردو نثر کے بانی کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مہجور نے "تذکرۂ شعرائے کشمیر" اور "آئینہ اتحادِ کشمیر" اور دوسرے موضوعات کو درست کر لیا تھا۔ لیکن اس نابغہ کی یہ تصنیفات نامکمل ہونے کی بناء پر زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوسکیں۔ عبدالاحد آزاد کی حیثیت اس لحاظ سے اہم ہے کہ اُن کے تذکرے کی شان محققانہ استدلال ناقدانہ اور زبان عالمانہ ہے۔ ریاستِ جموں و کشمیر میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں (انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی) حاصل ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں شخصی حکومت کے خاتمے کے بعد بھی اس کی یہ حیثیت برقرار رہی ۱۹۵۲ء میں ریاست کی قانون ساز اسمبلی نے اس زبان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر دفعہ ۱۴۵ کے تحت اس کو اس کی سرکاری حیثیت کی توثیق کی۔ ریاستی کلچرل اکیڈمی اور کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کی تاسیس کے ساتھ ہی کشمیر میں اُردو نثر کا ایک تابندہ دور شروع ہوا۔ کلچرل اکیڈمی نے ترجیحی بنیادوں پر اُردو میں کتابوں کی اشاعت کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس ادارے نے مصنفین کتابیں شائع کرانے کے لئے مالی معاونت بھی بہم پہنچائی۔ نتیجے کے طور پر اس ادارے کی بدولت کشمیر میں اُردو نثر کا ایسا سرمایہ منصہ شہود پر آگیا جو کہ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے گراں قدر ہے۔

کشمیر یونیورسٹی کا شعبۂ اُردو کشمیر کے اُردو نثری سرمائے میں اپنے روزِ اوّل سے ہی جلوہ صد رنگ بکھیر رہا ہے۔ اِس ادارے سے وابستہ پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین زور اور پروفیسر شکیل الرحمٰن نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں اور مضامین لکھ کر مقامی نوجوانوں کو اُردو نثر لکھنے کی باقاعدہ تحریک دی۔ پروفیسر سروری نے کتاب "کشمیر میں اُردو" (تین جلد) تحریر کر کے پہلی بار ایک طرف کشمیر کے دبستانِ اُردو کو بیرونی دنیا میں متعارف کیا تو دوسری طرف یہاں کے

اُردو کے اوراقِ پریشان کی شیرازہ بندی کی طرف مستحسن قدم اُٹھایا۔ انہوں نے اگرچہ شاعری، افسانہ، مثنوی اور دوسرے موضوعات پر اہم کتابیں تصنیف کیں لیکن کشمیر میں فارسی اور اُردو ادب کی تاریخ پر اُن کا کام بنیادی نوعیت کا ہے جس سے کوئی بھی محقق صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

حامدی کاشمیری نے اپنی تحقیقی مقالہ ''جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات'' سے جس تحقیقی اور تنقیدی سفر کا آغاز کیا وہ حال ہی میں اُن کے مضامین کے مجموعہ ''تقلیب و تحسین'' (مرتبہ مصرہ مریم) تک جاری و ساری ہے۔ اس دوران انہوں نے میر، غالب، اقبال جیسے کلاسیکی شعراء پر بھی قلم اُٹھایا اور ناصر کاظمی اور بلراج کومل جیسے جدید شعراء پر بھی خامہ فرسائی کی۔ اس دوران گوناگوں موضوعات پر اُن کی درجنوں کتابیں اور سینکڑوں مضامین اُن کی ہمہ پہلو شخصیت کی دلیل بن کر سامنے آئے۔ حامدی نے اپنی کتاب ''معاصر تنقید'' میں نہ صرف مروّجہ تنقیدی رویوں کے تئیں عدمِ طمانیت کا اظہار کیا بلکہ ایک نئی تھیوری کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ حامدی کی تنقیدی تھیوری ''اکتشافی تنقید'' اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے بقول پروفیسر نذیر احمد ملک موجودہ زمانہ کی رائج گوناگوں تنقیدی نظریات کے باوجود تفہیمِ ادب کا جو نیا نظریہ پیش کیا وہ اُردو کی نئی نسل میں اعتبار اور استناد کا درجہ حاصل کر رہا ہے۔ حامدی کا نظریہ تنقید شمس الرحمان فاروقی اور وزیر آغا کی تنقید سے اس لحاظ سے میل کھاتا ہے کہ یہ سب نقاد متن اور قرآت کو تفہیم ادب کے لئے بنیادی وسیلہ مانتے ہیں۔ لیکن حامدی شمس الرحمان فاروقی کے نظریۂ معنی آفرینی کے بجائے متن سے اُبھرنے والی سچویشن پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ حامدی کے نظریئے پر اُردو حلقوں میں اُس حد تک بحث و تمحیص نہیں ہو پائی جس کا یہ متقاضی تھا۔ انہوں نے اپنی تھیوری کا اطلاق بعض نظموں پر کیا اور اس طرح اپنے نظریئے نقد کا عملی اطلاق بھی کیا۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کا اصل میدان تحقیق ہے تاہم انہوں نے تنقید کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا۔ تحقیق میں بھی اُن کے بنیادی موضوعات اُردو کی رثائی شاعری اور اقبالیات ہیں۔ اس کے باوصف انہوں نے میر سے لے کر زور اور دیگر مشاہیر کے کئی گوشوں کو منکشف کیا۔ ''مضامین حیدری'' اور ''تحقیق و تنقید'' میں حیدری نے مختلف موضوعات پر بحث کے در وا کیے۔ ''دیوانِ میر'' مطالعۂ زور اور علامہ زنجانی'' جیسی مفصل کتابوں کے علاوہ دیگر موضوعات پر اُن کے سینکڑوں مضامین ملک اور ملک سے باہر کے جرائد میں چھپ چکے ہیں۔

کشمیر کی اُردو نثر میں محمد یوسف ٹینگ کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ کلچرل اکیڈیمی کے رسائل شیرازہ اور ہمارا ادب کی ادارت کے دوران انہوں نے کشمیر کی ثقافت، عمرانیات اور ادب پر دسیوں مضامین سپردِ قلم کئے۔ اس کے علاوہ اکیڈیمی کے سلسلۂ شائع شدہ کتابوں پر اُن کے لکھے ہوئے دیباچے تنقیدی شان کے حامل ہیں۔ ''شناخت'' نامی کتاب کی اشاعت سے لے کر ''کشمیر قلم'' تک اُن کا بحیثیتِ نثر نگار سفر گوناگوں موسیقی، خطاطی، نقاشی، زبان، رہن سہن، آثار قدیمہ، تاریخ، لوک ادب اور عمرانیات پر اُن کو عبور حاصل ہے۔ ٹینگ کی نثر میں استعارات کی بھرمار اگرچہ یہ اسے رنگین اور مرصع بناتی ہے لیکن اس وجہ سے اکثر اوقات ترسیل میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔

کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں حامدی کاشمیری کے علاوہ جن اساتذہ نے کشمیر میں اُردو کے نثری سرمایہ میں اضافہ کیا اُن میں برج پریمی، محمد زمان آزردہ، نذیر احمد ملک اور مجید مضمر شامل ہیں۔ برج پریمی کا بنیادی موضوع سعادت حسن منٹو ہے۔ منٹو پر اُن کا تحقیقی مقالہ شائع ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کشمیر کے تعلق سے بہت سے مضامین لکھے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ اُن کے فرزند ڈاکٹر پریمی رومانی، جو کہ خود بھی اچھے نثر نگاروں میں شامل ہیں، مرحوم کی غیر شائع شدہ نگارشات کو مسلسل شائع کرنے میں پوری لگن کے ساتھ مہنمک ہیں۔ پروفیسر محمد زمان آزردہ نے دبیر پر مقالہ لکھ کر دبیریات میں اچھا خاصا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیگر موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا۔ آزردہ کی نثر میں اس وجہ سے انشائیہ کا رنگ جھلکتا ہے کہ وہ اصل میں انشائیہ سے دلی رغبت رکھتے ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید اگرچہ کشمیری الاصل نہیں لیکن شبیب رضوی ہی طرح وہ مستقلاً یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے ''ادب اور سماجیات'' جیسے پامال موضوع سے تنقید کا جو سفر شروع کیا تھا وہ آج کل جدیدیت، مابعد جدیت اور دیگر نظریات تھیوریز کی حد پھلانگ رہا ہے۔ نذیر احمد ملک بنیادی طور پر ایک ماہرِ لسانیات ہیں اور انہوں نے اپنی کتاب میں اُردو رسم الخط کی تاریخ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور لسانیاتی اصولوں کی روشنی میں معروضی نتائج اخذ کئے ہیں۔ مزید برآں کشمیری الفاظ کے سرچشموں کی کھوج میں تقابلی لسانیات کے اصولوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ نوم چومسکی، رولاں بارت اور دیگر معتبر یورپی ماہرین کی تفہیم میں اُن کے مضامین مشعل راہ ہیں۔ مجید مضمر کا مرغوب میدان فکشن ہے اور انہوں نے اُردو کی علامتی افسانہ نگاری پر قابلِ تحسین کام انجام دیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کشمیری

ڈرانہ اور دیگر موضوعات پر کئی اہم مضامین لکھے ہیں۔ مجید مضمر نے اگرچہ کئی پیچیدہ موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے، تاہم اُن کی نثر سادہ اور دلکش ہے۔ فرید پربتی نے کلاسیکی شاعری اور صنفِ رباعی پر اچھا خاصا تنقیدی کام کیا لیکن افسوس یہ ہے کہ موت نے اُن کی پوشیدہ صلاحیتوں کو پوری طرح سے نمایاں ہونے کا موقع نہیں دیا۔

شعبۂ اُردو کا سالنامہ مجلّہ بازیافت (جو کہ پہلے ادبیات کے نام سے شائع ہوا کرتا تھا) کسی وقفے کے بغیر شائع ہو رہا ہے۔ اس میں نہ صرف کشمیر کے مقتدر قلمکاروں کے فکر انگیز مضامین شائع ہو رہے ہیں بلکہ اس میں بیرون ریاست کے چند محققوں اور نظریہ سازوں کے مضامین بھی شامل ہوتے ہیں، اس شعبے کے ذریعے اب تک سو سے زائد محققین نے مختلف اور متنوع موضوعات پر پی، ایچ، ڈی اور ایم فل کے لئے تحقیقی مقالے مکمل کئے ہیں اور اس وقت بھی درجن بھر اسکالر تحقیق کے کام میں مشغول ہیں۔

اقبال کے فکر و فلسفہ نے کشمیر میں تخلیق ہونے والے ادب پر زبردست اثرات مرتسم کئے ہیں۔ یہ اثرات یہاں کی اُردو شاعری کے ساتھ کشمیری ادب میں بھی نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اقبال کی فکر کی تفہیم کے لئے تنقید نگاروں کا ایک قافلہ بیسویں صدی کے اوائل سے ہی سامنے آنا شروع ہو گیا۔ اقبالیات کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں شیخ محمد عبداللہ کی فرمائش پر آل احمد سرور نے کشمیر میں اقبالیات پر پہلا لیکچر دیا۔ ۱۹۷۷ء میں کشمیر یونیورسٹی میں مسندِ اقبال قائم ہوئی اور سرور صاحب کو اسکالر ڈائریکٹر تعینات کیا گیا اور تقریباً دس برس تک وہ اس کے ساتھ وابستہ رہے۔ اِس دوران انہوں نے متعدد سمینار، کانفرنسیں، مذاکرے اور مباحثے کرائے۔ نتیجے کے طور پر اقبالیات پر لکھی جانے والی نثر کا ایک بہترین سرمایہ وجود میں آ گیا۔ اس انسٹی چیوٹ کے ساتھ وابستہ دیگر اساتذہ پروفیسر محمد امین اندرابی، پروفیسر بشیر احمد نحوی اور پروفیسر تسکینہ فاضل نے اقبال کے فکر و فن پر انہماک کے ساتھ درجنوں کتابیں اور سینکڑوں مضامین لکھے۔ ان میں اقبال کے نظریات پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی اور اقبالیات پر پی ایچ ڈی اور ایم فل کے مقالے تحریر کئے۔ اقبال انسٹی چیوٹ میں پڑھائے جانے والے مضامین بھی شائع ہوتے ہیں اور ریاست اور بیرون ریاست کے معتبر ادیبوں کی نگارشات بھی چھپتی ہیں۔ پروفیسر اسداللہ وانی کے مطابق جموں و کشمیر سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد میں اقبالیات پر

تین سو مضامین نگاروں کے تقریباً آٹھ سو مضامین شائع ہو چکے ہیں (شیرازہ خصوصی نمبر ۱۹۹۸ء)۔ وانی صاحب کا مضمون ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا تھا۔ تب سے اب تک یعنی ۱۵ر برسوں میں اقبالیات پر اور بھی سینکڑوں مضامین لکھے گئے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبالیات پر لکھے جانے والے مضامین کی تعداد ایک ہزار سے تجاوز کر چکی ہوگی۔ اقبال انسٹی چیوٹ نے بشیر احمد نحوی کے زمانہ صدارت میں ادارے سے باہر کے ادیبوں سے بھی اقبالیات پر کتابیں لکھوائیں۔ اقبالیات کے حوالے سے شائع ہونے والی کتب اور مضامین کی تفصیل عبداللہ خاور نے "مفتاحِ اقبال" نامی ضخیم اشاریہ میں دی ہے جس سے اقبالیات کی کشمیر میں مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اقبال انسٹی چیوٹ کے علاوہ کلچرل اکیڈیمی نے بھی اقبالیات پر زبردست کام کیا۔ ۱۹۷۷ء ریاست میں اقبال کے سال طور پر منایا گیا۔ ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے اُس سال مختلف تقاریب کا انعقاد کیا اور شیرازہ کا خصوصی اقبال شمارہ شائع کیا جس میں اقبال کی حیات اور فکر پر مفصل انداز میں لکھا گیا۔ اقبال پر انفرادی طور پر لکھنے والوں میں پروفیسر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، پروفیسر مرغوب بانہالی، پروفیسر غلام رسول ملک، ڈاکٹر چمن لال رینہ، ڈاکٹر بدرالدین بٹ، ڈاکٹر حیات عامر حُسینی، ڈاکٹر نذیر احمد شیخ، ڈاکٹر نذیر احمد بٹ، قاری سیف الدین اور سید علی شاہ گیلانی نمایاں ہیں۔

گزشتہ دہائی میں کشمیر میں چند تازہ دم محققین اور نقاد سامنے آئے، انہوں نے مرزا غالب اور اقبال جیسے کلاسیکی شعراء سے لے کر خلیل الرحمٰن اعظمی، ناظر کاظمی، شہر یار، فاروقی اور نارنگ جیسے جدید ادباء پر درجنوں کتابیں اور سینکڑوں مضامین شائع کئے۔ ان قلمکاروں کی پذیرائی ریاست سے باہر کے معتبر رسائل مثلاً شب خون، آج کل، شاعر، اُردو دنیا میں ہوئی، ان لوگوں نے بوجھل نثر اور روایتی استعارہ سازی کے بجائے معروضی انداز میں غیر مبہم زبان کے ذریعے اپنے افکار و خیالات کی ترسیل میں کامیابی پائی۔

ان لوگوں میں ڈاکٹر شفق سوپوری، ڈاکٹر عبدالرشید خان، منصور احمد منصور، نصیر احمد میر عازم، سلیم سالک، نگہت نظر، زور کاشمیری، بشیر گلزار پوری، ریاض توحیدی، جاوید ماٹجی، شہباز قادری، ریحانہ اختر، گلزار احمد وانی کے شانہ بشانہ راقم الحروف شامل ہے۔

کشمیر میں فکشن کے حوالے سے بھی نثر کی ایک اچھی خاصی روایت موجود ہے۔ یہاں کی افلاس زدہ خوبصورتی کے موضوع پر باہر کے فکشن نگاروں مثلاً جمنا داس اختر، کرتار سنگھ دُگل اور

کشمیری لال ذاکر نے بہت کچھ لکھا۔ پونچھ میں زندگی کا بیشتر حصہ گزارنے والے معروف افسانہ نگار کرشن چندر کے افسانوں میں جموں و کشمیر ایک زیریں لہر کی طرح موجود ہے۔ اسی طرح کشمیر میں فکشن کی ابتداء کرنے والوں میں بھی باہر کے ادبا مثلاً محمد الدین فوق اور سالک رام سالک کی کوششیں نمایاں ہیں۔ لیکن جس فرزندِ کشمیر کے سر یہاں پر فکشن نگاری کی کوشش کرنے کا سہرا جاتا ہے وہ ہے شاعرِ کشمیر مہجور۔ مہجور نے بیسویں صدی کے ربع اوّل میں اپنے ناول ''عزیز'' کا اشتہار شائع کرایا تھا۔ لیکن اُن کا یہ کارنامہ بھی اُن کے دیگر مسوّدات کی طرح نامکمل رہ کر دیمک کی خوراک بن گیا۔

کشمیر میں فکشن کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۰ء کے بعد اُس وقت ہوا جب پریم ناتھ پردیسی، حامدی کاشمیری، پریم ناتھ در، علی محمد لون، اختر محی الدین، غلام رسول سنتوش، بنسی نردوش، تیج بہادر بھان اور نور شاہ جیسے افسانہ نگار سامنے آئے۔ پردیسی اور در نے پریم چند کے تتبع میں کشمیر کی افلاس زدہ زندگی کو اپنا موضوع بنایا۔ حامدی کاشمیری نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول بھی لکھے۔ اُن کے افسانے رسالہ ''بیسویں صدی دہلی میں تواتر کے ساتھ چھپتے رہے، فکشن کے میدان میں حامدی نے ''بہاروں میں شعلے'' ناول لکھ کر قدم رکھا۔ اگرچہ انہوں نے بلندیوں کے خواب'' پگھلتے خواب، اجنبی راستے، ناولوں میں کشمیر کی زندگی اور یہاں کے سیاسی اور سماجی حالات کو شدت کے ساتھ پیش کیا لیکن اُن ناولوں میں انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کی ترسیل بھی خوبی کے ساتھ کی۔ بعد میں انہوں نے تنقید اور شاعری کا اپنا مستقل مشغلہ بنا دیا۔ علی محمد لون اور اختر محی الدین نے ابتداء اُردو میں کچھ خوبصورت افسانے لکھ کر اپنے ادبی کیریئر کا آغاز کیا لیکن بعد میں لون، کشمیری ڈرامہ اور اختر کشمیری افسانے کی طرف چل نکلے۔ اسی طرح غلام رسول سنتوش نے اُردو فکشن سے ابتداء کر کے مصوری میں پناہ لی۔

نور شاہ نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس افسانے لکھنا شروع کئے۔ اُن کا یہ شوق آج تک پوری تندہی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ نور شاہ کے افسانے ریاست اور ریاست سے باہر تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ ''بے گھاٹ کی ناؤ، ویرانے کے پھول، من کا آنگن'' اور دوسرے افسانوی مجموعوں کے علاوہ اُن کے ناول ''نیلی جھیل کے سائے، پائل کے زخم، اور ناولٹ آدھ سو جائیں'' منظرِ عام پر آئے ہیں۔ حال ہی میں اُن کے تازہ افسانوں کا مجموعہ'' آسمان پھول اور لہو

''شائع ہو گیا۔ نور شاہ کے برادرِ اصغر بشیر شاہ کے افسانوں کا مجموعہ ''شب کے سمندر میں'' اُن کی موت کے بعد دادِ تحسین حاصل کر چکا۔ گزشتہ برسوں میں کشمیر کے اُردو فکشن کی دُنیا میں عمر مجید، شبنم قیوم، جان محمد آزاد، فاروق رینزو، نگہت نظر اور مشتاق مہدی نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان سب قلمکاروں کے موضوعات مختلف اور گونا گوں ہیں لیکن سبھوں کی تخلیقات میں کشمیر کا درد قدر مشترک ہے۔ شبنم قیوم کا فن، فیکٹو فکشن کے زمرے میں آتا ہے۔ جب کہ فاروق رینزو، عمر مجید اور آزاد کے فن پاروں میں خواب آفرینی اور رومان کے ساتھ ساتھ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت ہے۔ مشتاق مہدی اور نگہت نظر کے افسانے المیہ اور اساطیری فضا کی وجہ سے قابلِ داد ہیں۔ نگہت کے ہاں تانیثیت بھی جگہ جگہ جلوہ نما ہوتی ہے۔

کشمیر کی موجودہ سیاسی غیر یقینیت چند اہم نثر پاروں کا مُحرک بن گئی۔ سیاسی موضوعات کو کہیں کہیں راست انداز میں تو کہیں افسانوی طرز میں پیش کیا گیا۔ شبنم قیوم کے ناول ''یہ کس کا لہو ہے کون مرا، اور ''کشمیر جاگ اٹھا''، نعیمہ احمد مہجور کا ''دہشت زادی'' میں کشمیر کے سیاسی حالات کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ سید علی شاہ گیلانی کی سوانح عمری ''ولر کے کنارے'' (۲ جلد) اور مقبول ساحل کی کتاب ''شبستانِ وجود'' میں کشمیر کی پیچیدہ سیاست پر کھل کر بات کی گئی ہے۔ اس سے قبل کشمیر کی سیاست پر شیخ محمد عبداللہ کی کتاب ''آتشِ چنار'' اور سید میر قاسم کی ''داستانِ حیات'' شائع ہو کر کئی سیاسی گتھیوں کی نقاب کشائی کر چکی تھیں۔ اسی دوران کشمیر کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ پر کئی اہم کتابیں سامنے آئیں۔ ہر چند کہ محمد یوسف ٹینگ نے اس ضمن میں کئی مضامین سپردِ قلم کئے تھے لیکن خالد بشیر کی کتاب ''دیدۂ آبِ رواں'' میں دریائے جہلم سے وابستہ کشمیر کی تہذیب اور ثقافت کا جائزہ منضبط تجزیہ معروضی بنیادوں پر کیا گیا ہے۔

کشمیر میں اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں اُردو نے ماضی ہی طرح عہد حاضر میں بھی اہم حصہ ادا کیا ہے۔ اشاعتِ دین کے حوالے سے آئے دن اخبارات و جرائد میں مختلف نوع کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ''نصرۃ الاسلام'' اور ''الحیات'' اور دیگر رسائل میں شائع مضامین اِس قسم کی نثر میں اضافے کے موجب ہیں۔ جماعت اسلامی کشمیر، جمعیتِ اہلِ حدیث اور انجمن تبلیغ الاسلام کے اشاعتی شعبوں نے دینی کتب کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ مرحوم میر واعظ مولوی محمد فاروق کے واعظ کے مجموعوں ''اسلام کا آفاقی پیغام'' اور ''اسلام کی بنیادی تعلیم''

کی اشاعت سے ایک عام فہم اور شیریں نثر سامنے آئی ہے۔ انجمن نصرۃ الاسلام ہی سے وابستہ محمد سعید الرحمٰن شمس نے بھی دینی نثر میں اچھا خاصا اضافہ کیا ہے۔

چنانچہ اُردو یہاں پر سرکاری زبان ہونے کے ساتھ رابطے کی زبان بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی زبانوں کی تفہیم یہاں پر اُردو کی وساطت سے ہی ہوتی ہے۔ عربی اور فارسی کی تاریخی اور ادبی کتابوں کے ترجمے کے ساتھ ساتھ زبانوں سے متعلق تحقیق وتنقید میں بھی اُردو نثر سب سے موثر ذریعہ ہے۔ آج تک شعبۂ عربی اور فارسی سے وابستہ ریسرچ اسکالروں نے اُردو میں دسیوں پی، ایچ، ڈی مقالے تحریر کئے ہیں۔

کشمیر میں تحریر کی جانے والی اُردو نثر میں انشائیوں، مکتوب نگاری اور سفرناموں کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ مرزا محمد زمان آزردہ کے انشائیوں کے علاوہ منصور احمد منصور نے بھی انشائیے لکھے ہیں جن کو قدوس جاوید "شگفتانے" کہتے ہیں۔ ان شگفتہ تحریروں کی موجودگی یہاں پر طنزیہ نثر کی کمی کو کسی حد تک پورا کرتی ہے۔ تنہا انصاری کے مکاتیب کے بعد مکتوب نگاری میں کسی قسم کی پیشِ رفت نہیں ہوسکی۔ البتہ حامدی کاشمیری کے سفرناموں کے کئی برسوں بعد ایاز رسول نازکی کا مختصر سفرنامہ سامنے آیا ہے اور اس وقفے میں کئی سفرنامہ ہائے حج نے اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں مدد دی ہے۔

کشمیر کی اُردو نثر کے حوالے سے یہ مضمون نامکمل ہوگا اگر حسبِ ذیل قلمکاروں کا ذکر نہ کیا جائے، جنھوں نے ماضی میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ یہ ہیں خواجہ ثناء اللہ بٹ، غلام نبی خیال، ہری کرشن کول، نشاط انصاری، شمس الدین شمیم، وحشی سعید ساحل، محمد احمد اندرابی، آج کے دور میں محمد اشرف ٹاک، شاہ نواز ٹینگ اور طاہر محی الدین پرورش لوح قلم کرنے میں لگن کے ساتھ مہنمک ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

جموں و کشمیر میں اُردو تحقیق

تحقیق کے لغوی معنی حقیقت کی تلاش یا کھوج کے ہیں۔ یہ کائنات اور اس کی ہر شے انسان سے تحقیق کا تقاضا کرتی ہے۔ تحقیق کا جذبہ وہ پاک جذبہ ہے جو انسان کو نہ صرف معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ انسان کو عقل و شعور فکر و بصیرت اور تہذیب و شائستگی سے بھی روشناس کرتا ہے۔ مزید برآں یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دُنیا میں جتنی بھی عظیم اور حیرت انگیز ایجادات ہوئی ہیں یہ سب تحقیقی جذبے کا نتیجہ ہیں۔ یہ ابتدائے آفرینش سے تحقیق کا جذبہ انسان کی زندگی میں کارفرما رہا ہے۔ کیونکہ مظاہرِ فطرت کی تمام پوشیدہ طاقتوں کو جاننے، اُن سے فیضیاب ہونے اور خوب سے خوب تر کی جُستجو اور کُرید کا جذبہ فطری طور پر انسان کی سرشت میں موجود ہے۔ چنانچہ یہ وہ جبلی قوت ہے جس نے تہذیبی، تمدنی اور سائنسی سفر کو جاری رکھنے کے لئے انسان کو ہر دور میں مجبور کیا ہے۔

جہاں تک اُردو ادبی تحقیق کی عمر کا تعلق ہے وہ تقریباً دو سو برس کے عرصے پر محیط ہے مگر اس کے باوجود اسے جن ممتاز محققوں نے انتہائی محنت و لگن اور ایماندارانہ جذبہ کے تحت ٹھوس اور مستحکم بُنیادوں پر اُستوار کر کے حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا کے مصداق بنایا اُن میں سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، محمود شیرانی، سید سُلیمان ندوی، مولوی عبدالحق اور تقسیم ہند کے بعد مسعود حسن خان رضوی ادیب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، گیان چند جین، پروفیسر گوپی چند نارنگ، رشید حسن خان، مالک رام، اسلم فرخی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر جمیل جالبی، مُشفق خواجہ، محمود الٰہی، نُورالحسن ہاشمی، سیدہ جعفر اور وحید قریشی اُردو تحقیق میں ایسے معتبر نام ہیں جنھوں نے تحقیق کے اصول اور طریقۂ کار مرتب کر کے اسے باضابطہ طور پر ایک سائنسی علم بنا دیا۔ ان محققین کے بعد جن لوگوں نے اُردو تحقیق میں اپنا نام و مقام پیدا کیا، اُن میں نُورالحسن نقوی، نذیر

احمد، مختیار الدین احمد، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر عابد پیشاوری، پروفیسر عبدالستار دلوی، کالی داس گپتا رضا، پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر منظر اعظمی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر برج پریمی، ڈاکٹر اکبر حیدری، محمد یوسف ٹینگ، عبدالغنی شیخ لداخی اور پروفیسر ظہور الدین جیسے محققین کے اسمائے گرامی خاص اہمیت کے حامل ہیں کہ جنھوں نے اُردو تحقیق کو نہ صرف نئی جہتوں سے آشنا کیا بلکہ اسے اعتبار و معیار اور وقار بھی بخشا۔

تحقیق نہایت مشکل عمل ہے۔ ادبی تحقیق میں موضوع کے انتخاب سے لے کر مواد کی فراہمی، حوالوں کے معتبر اور غیر معتبر کی پہچان اور صحیح معلومات اخذ کرنے یا چھان پھٹک کے بعد مقالے کی تسوید ایسے دشوار گزار مراحل ہیں کہ جو بغیر اُصولِ تحقیق کی پیروی کے طے نہیں کیے جا سکتے۔ محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تحقیق بلاشبہ ایک کٹھن، صبر آزما اور محنت و دِقّت طلب کام ہے۔ بقول نارائن دت:

> "درحقیقت ادبی و تحقیقی مقالہ لکھنا جانفشانی کا کام ہے۔ سب سے پہلے موضوع کے مطابق مقالے کا خاکہ تیار کرنا ہوتا ہے اور پھر اس خاکے کے مطابق مواد اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد گہرے مطالعے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے پھر کہیں جا کے مقالے کو ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ یہ کام کافی محنت و لگن مانگتا ہے اور اس کام کو صرف اُردو زبان و ادب سے عشق کی حد تک محبت کرنے والے فنکار ہی انجام دے سکتے ہیں۔"[1]

تحقیقی کام کرنے والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا گروہ اُن افراد کا ہے جو تحقیق جیسے ایماندارانہ اور مُنصفانہ فریضے کو انفرادی حیثیت سے انجام دیتے ہیں۔ عشق اور ہوس کی تفریق کو وہ بہتر جانتے ہیں۔ تحقیق اُن کے نزدیک علمی فریضے کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ ان کے پاس علم و عمل اور مزاج میں کام کرنے کی لگن ہے۔ وہ شہرت اور دولت کی خاطر تحقیق نہیں کرتے مگر ایسے مخلصین کی تعداد بہت کم ہے۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو علمی و ادبی دانشگاہوں میں اُستاد کے عہدے پر فائز ہیں۔

ان کی دوہری ذمہ داری ہے کہ یہ بذاتِ خود بہترین تحقیق کارنامے انجام دیں۔ دوسرے اپنی زیرِ نگرانی میں طلبہ کو منتخبہ موضوعات پر اتنی زیادہ محنت کروائیں کہ ریسرچ اسکالر موضوع کے ساتھ صحیح انصاف کر سکے، کاتا اور لے دوڑی والا معاملہ نہ ہو۔ یہاں اس بات کو ذہن

---

[1] محکمہ السنہ پنجاب کی جانب سے لکھوائے گئے تحقیقی مقالات بشمول "پرواز ادب" (بھاشا وبھاگ پٹیالہ پنجاب۔ شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۹۹ء صفحہ ۳۱)

نشین کرلینا چاہیے کہ تحقیق ایک وادیٔ پُر خار کی مانند ہے۔ جس میں چلنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے اس لئے بھی کہ تحقیق کرنے والے میں چند بنیادی اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

پہلی صفت یہ ہے کہ تحقیق کار سچ کو اپنا شعار بنالے۔ تحقیق کو چونکہ سچ کا کاروبار کہا گیا ہے اس لئے کسی دوسرے کی تحریر یا دریافت کو بغیر حوالے کے درج کرلینا ایک غیر محققانہ عمل ہے۔ دوسری اہم صفت یہ ہے کہ تحقیق کار کو تحقیق سے بے حد دلچسپی اور ذوق و شوق ہو۔ ایک طرح کا ایسا ولولہ جو اُسے ہر وقت کام کرنے پر آمادہ کرتا رہے۔ اُس میں نامعلوم کو معلوم کرنے کی اُمنگ اور سُرید ہو۔ بے ترتیب مواد کو اس طرح ترتیب دے سکے کہ اس میں منطقی اور فکری ربط کے ساتھ وضاحت پیدا ہوجائے۔ تحقیق میں تیسری صفت یہ ہونی چاہیے کہ اُس کا تجربہ وسیع اور مطالعہ گہرا ہو۔ دریائے ادب کا شناور ہو۔ اُس نے اپنے موضوع سے متعلق پہلے ہی کافی معلومات حاصل کرلی ہوں۔ مجموعی طور پر تحقیق کار میں حق گوئی، بے تعصبی، بے غرضی، محنت و لگن، اخلاقی جرأت، غیر مُقلد مزاجی، ادبی علوم سے گہری دلچسپی اور واقفیت کا ہونا ضروری ہے۔

جموں و کشمیر میں اُردو تحقیق کے اوّلین نقوش ہمیں محمد الدین فوقؔ مرحوم کی بعض تحریروں میں ملتے ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ فوق کی تحقیق کا اصل دائرہ تاریخ ہے مگر اُن کے کئی تذکرے ایسے ہیں جن کا تعلق براہِ راست ادبی تحقیق کے ساتھ ہے۔ مثلاً ''یادِ رفتگاں''، ''تذکرہ علمائے لاہور''، تذکرۂ شعرائے لاہور'' اور ''تذکرہ اخبار نویساں''۔ فوق کی یہ تمام تصانیف تحقیقی نوعیت کی ہیں۔

محمد عمر نورالٰہی دو ادب نواز دوستوں نے مشترکہ نام سے ''ناٹک ساگر'' جیسی معرکہ آرا تصنیف بطور یادگار چھوڑی ہے جو ۱۹۲۴ء میں پہلی مرتبہ لاہور سے شائع ہوئی۔ مذکورہ کتاب ڈرامہ نگاری کے فن اور اس کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے اس میں حقائق کی بازیافت اور واقعات کی صحت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ مُصنفین نے بڑی جگر سوزی کے ساتھ مواد اکٹھا کیا ہے۔

حبیب کیفوی نے ''کشمیر میں اُردو'' کے عنوان سے ادبی حلقوں میں بحیثیتِ محقق اپنی شناخت قائم کی۔ مذکورہ کتاب میں فاضل مُصنف نے ''کوہستان جموں کا ایک عوامی شاعر داس علی'' ڈوگری کو دفتری زبان بنانے کی کوشش''۔ ''جموں و کشمیر میں اُردو کی ترویج و ترقی کی ابتداء'' سفرنامہ بخارا، اُردو کی پہلی تحریر'' اُردو کی ایک قدیم مثنوی کشمیر دربار میں دہلی کے نقیب'' کشمیر میں عیسائی مشنریوں کی آمد''، تعلیم کی ابتداء، جموں میں محرم کی مجلسیں، نظیرا کبرآبادی کی مقبولیت، جموں میں ناٹک

کمپنی کا قیام اور اُردو کی ترویج، کشمیر میں ہندوستان کے سیاحوں کی آمدورفت، اُردو کشمیری کے مُشترک الفاظ، صوبہ جموں کی تحصیل بھمبر میں فوجی دربار اور حکام کی اُردو میں تقریریں، انگریز ریکروٹنگ افسر میجر ٹنکرڈ کی اُردو میں تقریر، ڈاکٹر دیوان بدری ناتھ ریکروٹنگ سیکریٹری کی تقریر اور مشیرِ مال چودھری خوشی محمد ناظر کی تقریر جیسے ذیلی عنوانات کے تحت "کشمیر میں اُردو" سے متعلق مواد کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ تمام تاریخی اور لسانی حقائق واضح طور پر قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ مصنف نے اگرچہ اس کتاب کا نام "کشمیر میں اُردو" تحریر کیا ہے مگر اس میں جموں و کشمیر میں اُردو کی نشوونما کا بھی تفصیلی ذکر موجود ہے۔

عبدالاحد آزاد کی گراں مایہ تصنیف "کشمیری زبان اور شاعری" کو بھی ادبی تحقیق کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ تین جلدوں پر مشتمل یہ ضخیم تحقیقی مقالہ اگرچہ اُن کی حیات میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر نہیں آیا لیکن آزادی کے بعد ۱۹۶۹ء میں جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی نے اسے اہتمام سے تین جلدوں میں شائع کیا۔ "کشمیر زبان اور شاعری" عبدالاحد آزاد کا ایک ایسا جامع اور قابلِ قدر تحقیقی کارنامہ ہے جس میں لل دید سے مہجور کے عہد تک تقریباً تمام معروف اور غیر معروف شعرا کا ذکر معتبر ماخذ اور حوالوں سے ملتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا مذکورہ تحقیقی مقالہ کسی بھی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ریاست جموں و کشمیر میں اُردو تحقیق کے میدان میں جن محققوں نے اپنے تحقیقی کارناموں سے ادبی تحقیق کو وقار بخشا اُن میں ڈاکٹر اکبر حیدری، پروفیسر حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر برج پریمی، پروفیسر ظہورالدین، محمد زمان آزردہ، گیان چند جین، پروفیسر شیام کالرا (عابد پیشاوری) منظر اعظمی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر بشیر احمد نحوی، ڈاکٹر نذیر احمد ملک، ڈاکٹر مجید مضمر اور ڈاکٹر فرید پربتی (مرحوم) کے علاوہ اور بھی کچھ نام ہیں جنھوں نے تحقیق و تنقید کے رشتے کو مستحکم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ محمد یوسف ٹینگ کے علاوہ ان تمام محققین کا تعلق جموں اور کشمیر یونیورسٹی کے اُردو شعبہ جات سے رہا ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کا شمار جموں و کشمیر کے اہم محققین میں ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر محقق

تھے جن کی تحقیقی تصانیف کی کُل تعداد ستر ہے۔ اُنھوں نے محققانہ جگر کاری سے میر تقی میر، اقبال اور انیس کے علاوہ مرثیہ، تذکرے اور کلاسیکی شعروادب کے بے شمار دفینوں کو منظرِ عام پر لایا جو کہ گوشۂ گمنامی پڑے ہوئے تھے۔ اُن کے کئی تحقیقی کارنامے اُردوادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔

پروفیسر حامدی کاشمیری ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں۔ ناول، افسانہ اور جدید حسیات اور تقاضوں سے تعلق رکھنے والی شاعری میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں وہ اگرچہ اکتشافی تنقید کے بنیاد گذار ہیں لیکن اُن کی چند کتابیں براہِ راست تحقیقی نوعیت کی ہیں۔ مثلاً جدید اُردو نظم پر یورپی اثرات ''غالب کے تخلیقی سرچشمے'' اور ''کارگہہ شیشہ گری'' میر کا مطالعہ اُن کی تحقیق کے عمدہ نمونے ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری بین الاقوامی سطح کے شہرت یافتہ ادیب اور شاعر ہیں کہ جن کی تحقیقی اور تنقیدی سرگرمیاں برابر جاری ہیں۔

کشمیر کی تاریخ، تہذیب، ادب اور ثقافت کو جس ادبی شخصیت نے اُردو کے ذریعے متعارف کرایا وہ محمد یوسف ٹینگ ہیں۔ اُنھیں اپنے مادرِ وطن کشمیر سے بے پناہ محبت ہے۔ اس لئے اُن کی تحقیقی کُتب میں کشمیر اور کشمیری شعروادب کا پورا منظرنامہ درآیا ہے۔ اُن کا مطالعہ کافی گہرا اور مُشاہدہ حیران کُن ہے۔ ایک طویل عرصے تک ریاستی کلچرل اکیڈیمی میں منتظم کی حیثیت سے کام کرتے رہے کہ جہاں اُنھوں نے ''شیرازہ'' اور ''ہماراادب'' جیسے اُردو کے رسائل کو اپنی مدیرانہ صلاحیتوں سے وقار بخشا۔ میر، غالب، اقبال، ناصر کاظمی، منٹو اور کشمیری ادبیات کے حوالے سے رسول میر، مہجور، لل دید، شیخ العالم اور عبدالاحد آزاد وغیرہ پر اُن کے تحقیقی مضامین بصیرت افزا ہیں۔ گزشتہ برسوں کے دوران محمد یوسف ٹینگ کے تحقیقی مضامین جستہ شناخت، شش رنگ، اور کشمیر قلم، بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے شیخ نورالدین نورانیؒ جیسے صوفی شعرا سے لے کر للہ عارفہ اور شمس فقیر پر بھی تحقیق مقالے لکھے ہیں۔ ان تمام تحقیقی مضامین سے موصوف کی تحقیق سے دلچسپی اور اُن کے علمی وادبی شعور کی کارفرمائی کا پتا چلتا ہے۔

جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق کے حوالے سے آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی ایک اہم نام ہے۔ اُن کا اہم تحقیقی مقالہ ''سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے'' ہے کہ جس میں انھوں نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ منٹو کی حیات اور اُن کی علمی وادبی سرگرمیوں کو تحقیق کے طریقے کار کے مطابق ایک عمدہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی کا مذکورہ مقالہ نہایت جامع، مُستند ہونے کے

ساتھ ساتھ مثنویات کے سلسلے میں بنیادی ماٰخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ برج پریمی کی ''کشمیر کے مضامین''، ''جلوۂ صد رنگ'' ذوقِ نظر، اور 'جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما'' جیسی تحقیقی کتابیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ اُنھیں ادبی تحقیق سے گہرا شغف تھا اور اس کے تقاضوں کو وہ بخوبی جانتے تھے۔

صوبہ جموں سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ظہور الدین نے تحقیق و تنقید کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ قابلِ قدر ہیں۔ جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ رہنے کی وجہ سے اُنھوں نے نہ صرف ذہین اسکالروں سے اپنی نگرانی میں نئے موضوعات پر بہترین تحقیقی مقالے لکھوائے بلکہ خود بھی قابلِ تحسین تحقیقی کام کیا۔ ''بیسویں صدی کے اُردو ادب پر انگریزی کے ادبی رُجحانات'' ''صوبہ جموں میں اُردو زبان و ادب کی ترقی''، ''جدید اُردو ڈراما'' ''اور کہانی کا ارتقاء'' اپنے موضوع مواد اور زبان و بیان کے اعتبار سے تحقیقی تصانیف ہیں۔ دلائل و شواہد کے معاملے میں پروفیسر ظہور الدین نہایت احتیاط برتنے کے روا دار ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے پروفیسر محمد زمان آزردہ کا تحقیقی مقالہ ''مرزا سلامت علی دبیر...... حیات اور کارنامے'' تحقیقی مقالات کی بھیڑ میں ایک اہم مقالے کے حیثیت رکھتا ہے۔

یہاں اُن محققوں کا ذکر کرنا بھی لازمی معلوم ہوتا ہے جو کہ اگر چہ ریاستِ جموں و کشمیر کے باشندے نہیں تھے مگر وہ جموں یونیورسٹی کے اُردو شعبہ جات یا اقبال انسٹی چیوٹ میں بحیثیتِ پروفیسر کام کرتے رہے۔ اُن مقتدر ادبی شخصیات میں پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر شیام لعل کالرا، منظر اعظمی، پروفیسر عبدالقادر سروری، محی الدین قادری زور، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر آل احمد سرور، اور پروفیسر محمد حسن نے اُردو تحقیق کو جو وقار بخشا وہ یہاں کی اُردو ادبی تاریخ کے لئے باعث صد افتخار ہے۔ پروفیسر گیان چند جین جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے بانی تھے۔ وہ ایک طویل عرصے تک اس شعبے سے وابستہ رہے۔ یہاں رہتے ہوئے انھوں نے جو سب سے اہم تحقیقی کام کیا وہ ''تفسیرِ غالب'' ہے۔ یہ ایک ضخیم مقالہ ہے جس میں غالب اور غالبیات سے متعلق بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ پوری معلومات درج ہے۔ پروفیسر شیام لعل کالرا، عابد پیشاوری کا تحقیقی مقالہ ''انشا اللہ خان انشا دہلوی...... حیات، شخصیت اور کارنامے'' اس لحاظ سے نہایت اہم اور مثالی مقالہ ہے کہ اس میں تحقیق کے اصولوں کی خاص

پابندی کی گئی ہے۔ عابد پیشاوری نے انشا اللہ خان انشا سے متعلق بنیادی مآخذ تک رسائی حاصل کرنے کے بعد جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ بصیرت افروز ہیں۔ انھوں نے نہ صرف مستند مآخذ سے مواد حاصل کیا ہے بلکہ دوسرے شواہد کی روشنی میں اُن کی چھان پھٹک کی ہے۔ ڈاکٹر منظر اعظمی نے ''اُردو میں تمثیل نگاری'' اور ''سب رس'' کا تنقیدی جائزہ'' جیسے تحقیقی مقالے لکھ کر اُردو تحقیق کو فروغ بخشا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ رہے کہ جہاں انھوں نے ''کشمیر میں اُردو'' جیسا تاریخ ساز تحقیقی مقالہ لکھا جسے نہایت اہتمام کے ساتھ جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی نے شائع کیا۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے ''غالب کی جمالیات'' آل احمد سرور نے ''اقبال اور تصوف'' اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں رہتے ہوئے اقبال اور اقبالیات سے متعلق بہترین تحقیقی کام کیا۔ اس سلسلے میں اُن کی تحقیقی تصانیف میں ''اقبال اور کشمیر، اقبال اور مغربی مفکرین'' ''محمد اقبال ایک ادبی سوانح'' اور ''نشانِ منزل'' ادبی تحقیق میں خاص اہمیت و افادیت کی حامل ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ شعبے میں رہتے ہوئے جہاں اُنھوں نے اپنی نگرانی میں ''اُردو تنقید میں اقبال شناسی''، ''داستانی روایت اور اُردو ناول'' اُردو افسانے میں حقیقت نگاری''، ''اُردو تنقید پر سماجی و تہذیبی اثرات''، ''اُردو غزل میں ہندوستانی موسیقی کے عناصر''، ''اُردو افسانے کے فروغ میں سکھوں کا رول''، ''اکبری حیدری...... حیات اور کارنامے'' اور ''اُردو غزل جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک'' ایسے موضوعات ہیں جن پر ذہین اور سنجیدہ اسکالروں سے تحقیقی مقالات لکھوائے تو وہیں انھوں نے بذاتِ خود ''اقبال کی تخلیقت'' اور ''اقبال کی جمالیات'' پر قابلِ قادر کتابیں لکھیں۔

پروفیسر پروفیسر بشیر احمد نحوی کا تعلق اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر سے ہے۔ اُنھیں حافظِ کلامِ اقبال ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ چھبیس کتابوں کے مُصنف ہیں۔ ''مسائل تصوف اور اقبال'' کے علاوہ ''اقبال افکار و احوال'' اُن کی اہم تحقیقی کتب ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد ملک حال میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ تحقیق و تنقید اُن کا خاص ادبی میدان ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کی نگرانی میں اُنھوں نے ''اُردو رسمِ خط ارتقاء اور جائزے'' کے عنوان سے ایک عمدہ تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ پروفیسر مجید مُضمر کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں بحیثیتِ صدر کام کر رہے ہیں۔ ''اُردو

افسانے میں علامت نگاری'' اُن کا تحقیقی مقالہ ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے اس مقالے میں اُنھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اُن تمام حقائق کی نشاندہی کی ہے جو افسانے میں علامت نگاری سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذکورہ مقالے کو پڑھتے ہوئے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ محقق نے جانفشانی اور ادبی ذوق کی بنیاد پر ایک اچھا مقالہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر منصور احمد منصور بھی کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں کام کر رہے ہیں اُن کا تحقیقی مقالہ ''اُردو افسانے میں تہذیبی عناصر'' یقیناً ایک بہترین مقالہ ہے جس سے قاری نہ صرف معلومات حاصل کرتا ہے بلکہ زبان وبیان کی دلکشی سے بھی محفوظ ہوتا ہے۔

جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد، منظر اعظمی، پروفیسر ظہور الدین اور پروفیسر شیام لعل کالرا، عابد پیشاوری جیسے ذہین اور محنتی اساتذہ نے اُردو تحقیق کا جو اعتبار ومعیار قائم کیا تھا وہ اُن کے بعد قائم نہیں رہ پایا۔ البتہ پروفیسر سُکھ چین سنگھ، ڈاکٹر ضیا الدین، نصرت چودھری اور ڈاکٹر ریاض احمد اس سلسلے میں فکر مند نظر آتے ہیں کہ تحقیق جیسے علمی فریضے کو انجام دینے کے لئے ذہین باذوق اور ادب سے گہری دلچسپی رکھنے والے طلبہ کا صحیح انتخاب ہو۔

ریاست جموں وکشمیر کے علمی وادبی اداروں سے شائع ہونے والے رسائل وجرائد میں جو تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں وہ معیاری اور تسلی بخش ہوتے ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے ''بازیافت'' نام کا رسالہ شائع ہوتا ہے جس میں تحقیقی وتنقیدی نوعیت کے مضامین چھپتے ہیں۔ جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں پروفیسر ظہور الدین نے اپنی مساعی جمیلہ سے ''تسلسل'' نام کا ششماہی رسالہ جاری کروایا تھا جو فی الحال زندہ ہے۔ اس میں اساتذہ اور طلبہ کے تحقیقی مضامین چھپتے ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی کا اقبالیات کا شعبہ ''اقبال انسٹی ٹیوٹ'' نہایت قابل فعال ہے۔ اس شعبے کی تمام ادبی وتحقیقی سرگرمیاں ہر سال ایک مُجلّہ ''اقبالیات'' میں شائع ہوتی ہیں۔ اس مجلّہ میں اقبال سے متعلق تحقیقی مضامین کا تعلق اقبالؔ کے فکر وفن اور اُن کی حیات وشخصیت کے نئے پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے تحت اب تک تقریباً چالیس سے زائد طالبات تحقیق کر چکے ہیں۔

جموں وکشمیر کلچر اکیڈیمی کی جانب سے اُردو کا ایک موقر ومعیاری رسالہ ''شیرازہ'' تقریباً پانچ دہائیوں سے شائع ہوتا آرہا ہے۔ شروع میں اس جریدے کی ادارت کے فرائض محترم محمد یوسف ٹینگ نے انجام دیئے اور بہت کم مُدت میں اُنھوں نے اسے ملک کی مقتدر رسائل کی

فہرست میں شامل کرایا۔ ٹینگ صاحب کی ادارت میں ''شیرازہ'' میں ریاست اور غیر ریاستی محققوں اور نقادوں کی معیاری ادبی نگارشات شائع ہوتی تھیں۔ آج کل محمد اشرف ٹاک کی ادارت میں یہ جریدہ شائع ہوتا ہے۔ یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ انھوں نے بھی اس جریدے کے معیار کا خاص خیال رکھا ہے۔ سلیم سالک شیرازہ ''اردو'' کے معاون مدیر ہیں۔ حالیہ گزشتہ برسوں میں شیرازہ کے چند یادگاری شخصیات نمبر شائع کئے ہیں جن میں حامدی کاشمیری نمبر، غلام رسول شنوس نمبر، شمیم احمد شمیم نمبر، پشکرناتھ نمبر، عمر مجید نمبر، یسٰین بیگ نمبر، محمد یوسف ٹینگ نمبر، فرید پربتی نمبر، ہمعصر شاعری نمبر اور آٹھ جلدوں پر مشتمل جموں کشمیر اور لداخ (تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں) شامل ہیں

ریاست جموں وکشمیر کا محکمۂ اطلاعات بھی اردو کا ایک ماہنامہ ''تعمیر'' کے نام سے شائع کرتا ہے۔ ۱۹۵۴ء میں یہ رسالہ جاری کیا گیا تھا جس کی ادارت کے فرائض معروف سیاست داں، دانشور اور ادیب شمیم احمد شمیم نے انجام دیئے تھے، اُن کے بعد محترم محمد یوسف ٹینگ اور غلام نبی بابا کے علاوہ خالد بشیر صاحب کی ادارت میں ماہنامہ ''تعمیر'' شائع ہوتا رہا۔ اس رسالے کے کئی خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے مثلاً مہجور نمبر، آزاد نمبر، پریم چند نمبر اور جموں وکشمیر ادب نمبر قابلِ ذکر ہیں۔ ان سرکاری رسائل وجرائد کے علاوہ غیر سرکاری رسائل میں ماہنامہ ''حکیم الامت'' (سرینگر) سہ ماہی ''بزم ادب'' (کشمیر) ماہنامہ ''لفظ لفظ'' اور تقریباً نو ماہ سے ایک سہ ماہی رسالہ ''تفہیم''، ضلع راجوری سے شائع ہوتا ہے۔ ''حکیم الامت'' کے مدیر ظفر حیدری ہیں۔ ''بزمِ ادب'' کا ہر شمارہ تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ابن اسماعیل اس خالص ادبی جریدے کے مدیر ہیں تقریباً دس برس سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ ماہنامہ ''لفظ لفظ'' کے مدیر زاہد مختار ہیں جبکہ سہ ماہی رسالہ ''تفہیم'' کے مدیران خالد کرار اور عمر فرحت ہیں۔ ان تمام رسائل وجرائد میں نہ صرف ریاستی بلکہ بیرون ریاست کے قلم کاروں کے تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان رسائل و جرائد کے علاوہ روزنامہ ''کشمیر اعظمیٰ'' (جو بیک وقت جموں اور سرینگر سے شائع ہوتا ہے) اور ''اُڑان'' (جموں) میں بھی مقامی اور غیر مقامی قلم کاروں کی تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی نگارشات ہر ہفتے باقاعدگی سے شائع ہوتی ہیں۔

جموں وکشمیر یونیورسٹی کے اُردو شعبہ جات کے علاوہ بہت سے ایسے نام ہیں جو نہ صرف

اُردو تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ اُنھوں نے چند اہم موضوعات پر اچھے تحقیقی مضامین اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اُن میں ریاست جموں و کشمیر کے معروف ادیب اور لداخ کی تاریخ اور تہذیب و تمدن پر گہری نظر رکھنے والے عبدالغنی شیخ لداخی کا نام سرِ فہرست ہے، اُنھوں نے ''لداخ...... تہذیب و ثقافت''، ''لداخ...... محققوں اور سیاحوں کی نظر میں''، ''لداخ...... آزادی کے بعد''، ''قلم، قلمکار اور کتاب'' اور ''اسلام اور سائنس'' جیسی تحقیقی کتابیں لکھ کر اُردو تحقیق میں اپنا ایک خاص مقام بنایا۔ ان کے علاوہ ولی محمد بٹ اسیر کشتواڑی کہ جنھوں نے نہایت محققانہ جگر کاری سے ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت''، ''تصویرِ ضلع ڈوڈہ'' اور ''تاریخ اشاعتِ اسلام'' جیسی قابلِ قدر کتابیں لکھ ڈالیں ہیں۔ ٹی۔ آر۔ رینا نے میلا رام وفا کی شاعری اور اُن کی ادبی خدمات پر اچھا کام کیا ہے۔ اُنھوں نے حال ہی میں رشید حسن خان کے خطوط مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔ ان کے علاوہ غلام نبی خیال، خالد بشیر، نذیر آزاد، جوہر قدوسی، شفق سوپوری، محمد اسد اللہ وانی، پریمی رومانی، فاروق نازکی، ایاز رسول نازکی، پیارے ہتاش، مشعل سلطانپوری، شہباز راجوری، صابر مرزا، بلراج کمار بخشی، الطاف انجم، مرغوب بانہالی، کے ڈی مینی، منشور بانہالی، دیپک بدکی، بشیر بھدرواہی، امین بنجارا، ڈاکٹر عبدالرشید خان، پروفیسر محبوبہ وانی، ترنم ریاض، سیدہ نسرین نقاش، ڈاکٹر شفیقہ پروین، ڈاکٹر محمد اقبال، ڈاکٹر جاوید اقبال، مشاق فریدی، عبدالحق نعیمی، مشتاق قادری، شاذ شرقی، سجاد پونچھی، کے علاوہ کچھ اور بھی نام ہو سکتے ہیں۔ راقم الحروف کا تحقیقی مقالہ ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔ ۴۵۲ صفحات پر مشتمل یہ مقالہ ساڑھے چار برس کی مسلسل محنت و لگن کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ ۴۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اور ضخیم تحقیقی مقالہ ''اُردو ادب میں تانیثیت'' کو بھی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے اسی سال مارچ ۲۰۱۳ء میں چھاپا ہے۔ یہ مقالہ اس ناچیز کی دس سالہ عرق ریزی کے بعد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔

بہر حال ریاست جموں و کشمیر میں اُردو تحقیق کی صورتحال بہت حد تک اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہاں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو تحقیق جیسے کٹھن، صبر آزما اور دیانتدارنہ عملی فریضے کو تحقیقی اصولوں کے مطابق انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تحقیق سے اُن کا فطری میدان اُنھیں حقائق کی کھوج، اہمیت اور تجربہ، معتبر حوالے و حواشی اور شہادتوں سے صحیح نتائج اخذ کرنے اور اس

کے ساتھ ہی نتائج کی ادبی اہمیت کا مناسب شعور، زبان کی باریکیوں اور اُسلوب تحریر پر دسترس رکھنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ یہاں راقم الحروف کے اس بیان سے ہر کوئی اتفاق کرے گا کہ جب تک یونیورسٹی میں تحقیق اور بالخصوص ادبی تحقیق کے لئے محنتی، ہونہار، ذہین اور باصلاحیت طالب علموں کا انتخاب نہ کیا جائے گا تب تک ادبی تحقیق کا معیار ہرگز بلند نہ ہوگا۔ بصورتِ دیگر تحقیق کے نام پر ہزاروں صفحات تو سامنے آئیں گے لیکن سوائے توارد، سرقہ اور ہو بہو نقل یا سوائے اقتباسات کے مجموعوں کے اور کچھ نہیں ہوگا۔

''شیرازہ'' میں کشمیری، ڈوگری، پنجابی، لداخی اور بلتی کی منظومات شائع ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ اُن کے ساتھ اُردو ترجمہ بھی شامل ہو۔

(ایڈیٹر)

اُردو تحقیق۔ ۱۹۴۷ء کے بعد

ریاستِ جموں وکشمیر میں اُردو نثر نے حقیقی معنوں میں ۱۹۴۷ء کے بعد فروغ پانا شروع کیا۔ تقسیم ملک کے بعد ریاست میں شخصی راج کا خاتمہ ہوا، اور عوامی حکومت کی تشکیل کے بعد اُردو نثر کی اہمیت اور ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس دور میں ریاست کی سیاسی، معاشی، تمدنی اور تہذیبی منظرنامے میں تیزی سے تبدیلی رونما ہونے لگی۔ اُردو زبان کی جڑیں اصلی مسکن سے اکھڑنا شروع ہوگئیں مگر ریاست میں اُردو زبان کو آئینی تحفظ حاصل ہوا جس کے نتیجے میں اس کی ترقی اور ترویج کی نئی راہیں کھلنا شروع ہوگئیں۔ چنانچہ جموں وکشمیر کے شاعروں کے ساتھ ساتھ نثر نگاروں، افسانہ نگاروں، ڈراما نویسوں اور صحافیوں نے اپنی کاوشوں سے اُردو نثر نگاری کو مالا مال کرنا شروع کیا۔ اسی دوران یہ خوشگوار واقعہ بھی پیش آیا کہ ریاستی حکومت نے پرائمری اور مڈل کلاسوں کے لئے درسی کتابیں یہاں کے نامور مقامی مصنفین سے لکھوائیں۔ ان میں پریم ناتھ پردیسی، پروفیسر صاحب زادہ حسن شاہ، میر غلام رسول نازکی، تنہا انصاری، غلام احمد کشفی، پروفیسر ایم۔ اے۔ فاضلی غلام حسین نحوی اور پروفیسر ڈی مل شرما قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد جن نثر نگاروں نے تخلیقی سطح پر اپنی بنیاد مستحکم بنائی اُن میں پروفیسر حامدی کاشمیری سرِ فہرست ہیں۔ ان سے قبل اعلیٰ اور معیاری نثر کے لئے راہیں ہموار کرنے کے سلسلے میں میر غلام محمد طاوس، تنہا انصاری، فاضل کاشمیری، امین کامل، رحمان راہی اور قیصر قلندر جیسے شاعروں نے جو خدمات انجام دیں تھیں انہیں کسی بھی لحاظ سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً میر غلام محمد طاوس کی کتاب "یادوں کے آنسو"، تنہا انصاری کے خطوط کا مجموعہ "خاطرِ احباب" وغیرہ ریاست میں اُردو نثر کو فروغ بخشنے میں قابلِ ذکر ہیں۔ حامدی صاحب اگرچہ شاعر کی حیثیت سے

عالمگیر شہرت کے حامل ہیں۔ مگر افسانہ اور تنقید میں ان کے کارنامے وقار کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اُردو کی ادبی تنقید میں حامدی کاشمیری کا نام مستند اور معتبر ہے۔ حامدی کاشمیری نے اکتشافی تنقید کا نظریہ پیش کر کے نہ صرف اُردو تنقید میں ایک مجتہد کی حیثیت حاصل کی بلکہ اپنے تنقیدی نظریات سے اُردو تنقید کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

کشمیر میں اُردو نثر کی تاریخ میں پروفیسر اکبری حیدری کا نام ان کے تحقیقی کارناموں کی وجہ سے اہم ہے۔ انھوں نے اگرچہ رثائی ادب کی طرف اپنی زیادہ توجہ مبذول کی تاہم میر اور اقبال پر ان کی تحقیقی مقالات نگاہِ اعتبار سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کی کتابیں "مطالعہ ڈاکٹر زور" "تحقیق وانتقاد"، "تحقیقی جائزے" میر ضمیر وغیرہ تحقیقی اعتبار سے کافی اہم کارنامے ہیں۔ اقبال پر رقم کیا ہوا ان کا ایک تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں کلچرل اکادمی مستقبل قریب میں شائع کرنے کا اہتمام کررہی ہے۔ پروفیسر حیدری اگر فنِ شعر کے رموز اور تنقیدی شعور سے بہرہ ور ہوتے تو ان کی نگارشات حرفِ آخر تصور کی جاتیں۔

محمد یوسف ٹینگ نے اُردو نثر میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اکیڈمی کے رسالوں، شیرازہ اور ہمارا ادب نے انھیں اپنے نثری کارناموں کا سکہ بٹھانے میں ایک پلیٹ فارم کا کردار ادا کیا۔ ٹینگ نے اگر کشمیر ثقافت اور تمدن کے ساتھ ساتھ اپنی تنقیدی صلاحیتوں پر بھی توجہ دی ہوتی تو ان کا نام برِ صغیر کے معتبر نقادوں میں شمار ہوتا۔ بہر حال محمد یوسف ٹینگ نے کشمیر ثقافت اور تمدن کی بازیافت کے سلسلے میں اپنی پوری تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اُردو نثر کے دامن کو وسیع کر دیا۔

کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ جن اساتذہ نے اُردو نثر کو اپنی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کے مظاہرے کے لئے وسیلہ بنایا ان میں برج پریمی کا نام اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ انھیں تنقید اور تحقیق دونوں پر ماہرانہ دسترس بھی تھی۔ اگرچہ کشمیر کی تاریخ اور تمدن ان کا مرغوب موضوع رہا ہے مگر انھوں نے اسے مرکزی اہمیت نہیں دی۔ افسانے کی تنقید میں ان کا شمار معتبر نقادوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے سعادت حسن منٹو کی حیات اور فن پر جو تنقیدی اور تحقیقی کام کیا ہے وہ اُردو کے جید نقادوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔

شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی کے پروفیسر نذیر احمد ملک نے کئی لسانی مطالعے کئے ہیں۔ ان کی تحقیقی کاوشیں مقدار اور معیار دونوں کے اعتبار سے قابلِ لحاظ ہیں۔ انھوں نے کئی فن پاروں کا

اسلوبیاتی مطالعہ کر کے جدید لسانیاتی طرزِ تنقید کو متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر مجید مضمر اگر چہ بنیادی طور پر فکشن کے نقاد ہیں مگر انھوں شعریات کے مطالعے میں بھی اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ان کے علاوہ فرید پربتی نے جو کام رباعی کی تنقید کے حوالے سے کیا ہے اُسے ایک مستحسن کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فرید نے کلاسیکی شعریات کے فنی نکات پر کئی مقالے سپردِ قلم کئے ہیں۔

پروفیسر قدوس جاوید ایک ایسے نقاد ہیں جو ادب کے کسی موضوع پر اظہارِ خیال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اقبال کے علاوہ ''ادب اور سماجیات''، ''اسلوبیات، ساخیات پسِ ساخیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت جیسے کئی اہم موضوعات پر قابلِ قدر مقالے رقم کئے ہیں۔

بشیر احمد نحوی نے اقبال اور تصوف، اور وحدت الوجود کے علاوہ کئی کتابیں نثر میں تصنیف کی ہیں۔ حال ہی اقبالیات سے متعلق نحوی کی کئی تصانیف منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ان سے قبل پروفیسر محمد امین اندرابی نے بھی اقبالیات کے حوالے سے کئی اہم موضوعات پر خامہ فرسائی ہے۔ پروفیسر تسکینہ فاضل نے اقبال کے علاوہ فراق گھورکھپوری کے مختلف گوشوں پر کتابیں لکھی ہیں۔

ڈاکٹر برج کرشن ایمہ کے صاحبزادے پریمی رومانی تواتر کے ساتھ تنقیدی مضامین لکھنے میں مصروف ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی شعراء کے علاوہ معاصرین پر بھی قلم اُٹھایا اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اگر چہ ان کی تنقید تاثراتی انداز کی ہوتی ہے لیکن ان کے نظریات میں کہیں کہیں مشرقی شعریات اور نقد کے اصولوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر نذیر آزاد نے لغت نگاری پر کئی کتابیں تصنیف کر کے لغت نگاری کے اصولوں اور اُردو لغت کی تاریخ جیسے موضوعات پر کچھ قابلِ قدر انکشافات کئے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے چند لسانی مطالعے بھی کئے۔ ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''کشمیر امکانات'' ان کی تنقیدی بصیرت کا نمونہ ہے۔

خالد بشیر احمد بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ مگر کشمیر کی تاریخ کے ساتھ ان کی فطری مناسبت کی بناء پر انھوں نے ''دیدۂ آبِ رواں'' کے عنوان سے ایک ایسی کتاب تصنیف کی جو تاریخِ کشمیر کے کئی گوشوں کو اجاگر کرتی ہے۔ یہ کتاب جدید تحقیقی اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ مصنف نے معتبر اور مستند حوالوں کے ساتھ ساتھ اپنے استدلال اور معروضی نقطۂ نظر بروئے

کارلا کر ایک بڑی کمی کا ازالہ کیا ہے۔ کشمیر کے ثقافتی، تمدنی اور سیاسی تاریخ میں یہ کتاب ہمیشہ ایک معتبر ماخذ کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔

ڈاکٹر شفق سوپوری بھی بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ شاعروں کے ساتھ ساتھ انھوں نے افسانے، تنقیدی مضامین اور ڈرامے وغیرہ بھی تصنیف کئے ہیں۔ موسیقی اور عروض ان کے دو مرغوب موضوعات میں سے ہیں۔ انھوں نے موسیقی، شاعری اور لسانیات کے علاوہ اُردو غزل اور موسیقی جیسے نادر موضوعات پر کتابیں تصنیف کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ان کی کتاب ''کلامِ فیض کا عروضی مطالعہ اعلیٰ ادبی حلقوں میں موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ عبدالرشید، جوہر قدوسی، جان محمد آزاد، نگہت نظر وغیرہ بھی نثری سرمائے میں آئے دن کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

ISSN NUMBER: 832-2277-9833

(URDU)

SHEERAZA

Jammu Kashmir Mai Urdu Nasr

Vol: 51 Issue: 4

Published By:
J&K Academy of Art, Culture and Languages
Srinagar/Jammu